استحکامِ پاکستان
ڈاکٹر اسرار احمد

اسرار احمد

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

بار اوّل :ـــــ مارچ ۱۹۸۶ء ـــــ ۵۵۰۰

بار دوم :ـــــ مئی ۱۹۸۶ء ـــــ ۳۳۰۰

بار سوم :ـــــ اکتوبر ۱۹۸۷ء ـــــ ۲۲۰۰

نام پبلشرز ---------- اقتدار احمد، انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ---------- ۳۶ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

نام طابع ---------- رشید احمد چودھری

نام مطبع ---------- مکتبہ جدید پریس لاہور

مقام طباعت ---------- ۷، ریلوے روڈ۔ لاہور

کتابت ---------- غلام مرتضےٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں وہ متفرق طور پر اور اختصار کے ساتھ گذشتہ دس پندرہ سال کے دوران خطاباتِ جمعہ اور عام تقاریر خصوصاً مختلف مقامات کی بار ایسوسی ایشنز اور نیپا (NIPA) لاہور کے مختلف کورسز میں بارہا بیان ہوئے ہیں ـــــ لیکن گذشتہ ماہ اگست میں یہ مضامین پہلے ۲ تاریخ کو لاہور میں واپڈا ہاؤس کے کھچا کھچ بھرے ہوئے آڈیٹوریم میں ایک تین گھنٹے کی نشست میں اور پھر چند ہی روز بعد ۷ اور ۸ اگست کو راولپنڈی اور اسلام آباد کے سنگھم پر انجمن فیض الاسلام کے ہال میں ڈھائی ڈھائی گھنٹے کی دو نشستوں میں بیان ہوئے ـــــ تو اس پر خود میرے اندر بھی یہ داعیہ شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ انہیں تحریری صورت میں بڑے پیمانے پر مسلمانانِ پاکستان اور خاص طور پر اُس نوجوان نسل کے سامنے لایا جائے جو قیامِ پاکستان کے پس منظر اور قافلۂ ملّی کی اصل منزلِ مقصود کے بارے میں شدید ذہنی انتشار سے دوچار ہے ـــــ ساتھ ہی اس کا شدید تقاضا رُفقاء واحباب کی جانب سے بھی ہُوا۔

اِدھر میں ادیب یا مصنّف تو سرے سے ہوں ہی نہیں، اگر کبھی کسی زمانے میں مقصدِ زندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اظہار مافی الضمیر کے لیے قلم کا ذریعہ اختیار کیا بھی تھا تو گذشتہ دس سال سے تو یہ سلسلہ بھی بالکل منقطع تھا۔ چنانچہ اِس عرصے کے دوران جو کچھ میرے نام سے شائع ہُوا وہ اصلاً میرے خطابات اور دروس تھے جنہیں ٹیپ کی ریل سے صفحۂ قرطاس پر میرے بعض رُفقاءِ کار بالخصوص رفیقِ مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے منتقل کیا تھا ـــــ لہٰذا دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ خاص اِس مقصد سے حرمین شریفین کا سفر کیا جائے اور وہاں کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر ان خیالات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی جائے ـــــ اور اس خواہش نے رفتہ رفتہ 'ارادہ' کی صورت اختیار کر لی۔

رہا یہ معاملہ کہ اس ارادے کی تکمیل اس قدر جلد کیسے ہوئی؟ ـــــ تو یہ ایک طویل داستان ہے جس کو تفصیلاً بیان کرنے کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اللہ کے فضل و کرم سے ماہ اکتوبر ہی میں حرمین کی زیارت بھی نصیب ہو گئی اور ہفتہ ۱۲ تا منگل ۲۲ اکتوبر ۸۵ء تقریباً دس روز طائف میں برادرم ڈاکٹر شجاعت علی برنی کے مکان پر مطلوبہ سکون میسّر آ گیا اور اس عرصے میں کتاب کا مقدمہ اور پہلے تین ابواب

ضبطِ تحریر میں آگئے!

واپس آیا تو دل جہاں جگر کے الفاظ میں "ہلاکِ عشرتِ آغاز" تھا وہاں یہ خوف بھی مسلّط تھا کہ اب اس کی تکمیل پاکستان کی شدید مصروفیات کے علی الرّغم کیسے ہوگی۔ کہ اچانک ایک خیال دل میں آیا کہ کیوں نہ اس "نسیمے از حجاز" کی اشاعت کسی روزنامے کے ذریعے بالاقساط شروع کر دی جائے۔ اس سے مزید تحریر کا داعیہ تقویت پائے گا اور پاسِ عہد سے احساسِ فرض دو آتشہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت بھی فوراً پیدا فرما دی۔ رفیقِ گرامی شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے دیرینہ تعلّقات اور نوجوانی کے دور کی محبت و رفاقت کا رشتہ میر خلیل الرحمٰن صاحب سے تھا۔ انہوں نے میر صاحب سے یہ وعدہ حاصل کر لیا کہ یہ مضامین ہر جمعہ کو 'روزنامہ جنگ' کے جملہ ایڈیشنوں میں بیک وقت شائع ہوں گے۔ مَیں میر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے اس عہد کو پُوری طرح نباہا اور اس طرح ایک تو ان خیالات کی اشاعت وسیع حلقے میں ہو گئی اور دوسری اور اہم تر بات یہ کہ میرے اندر بھی پاسِ عہد کی بنا پر مسلسل لکھتے رہنے کا داعیہ برقرار رہا۔

جمعہ ۲۸ فروری تک جو کچھ اخبار میں چودہ[۱۴] اقساط میں چھپا وہ ساتھ کے ساتھ ماہنامہ 'میثاق' کی چار اشاعتوں میں بھی طبع ہو گیا ——— اور اب کتابی صورت میں پیشِ خدمت ہے۔

چونکہ یہ پیشِ نظر تالیف کا صرف 'حصّہ اوّل' ہے لہٰذا اس کے خاتمے پر ایک شدید تشنگی کا احساس پیدا ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ راقم کا ارادہ ہے کہ بلا تاخیر 'حصّہ ثانی' بھی ضبطِ تحریر میں لے آیا جائے جس کا عنوان "اسلامی انقلاب: کیا اور کیسے؟" ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جیسے اُس نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے نصفِ اوّل کی تکمیل کرا دی اُسی طرح نصفِ آخر کی تسوید و اشاعت کے مراحل بھی طے کرا دے!

ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی جانب ہم سب کو لوٹ جانا ہے، نہ کوئی خیر اللہ کی توفیق کے بغیر وجود میں آ سکتا ہے نہ ہی کوئی شر اُس کے اِذن کے بغیر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اُس نے نیّت کی ہو! ———

آخر میں پھر دست بدعا ہوں کہ "اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡـكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ" کے مصداق اللہ ہم سب کو اچھی اور درست 'بات' بھی نصیب فرمائے اور نتیجہ خیز پیدا کرنے والا نیک عمل بھی۔ آمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
لاہور - ۲۱ مارچ ۸۶ء

مندرجات

مقدّمہ

منظر و پس منظر

تصویر کا روشن رُخ

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پاکستان

خلاصۂ مباحث

مُقدمہ

① پاکستان کی عُمر کا چالیسواں سال

اور اس کی دینی اور تاریخی اہمیت

② چند ذاتی وضاحتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَتّٰٓى

یہاں تک کہ

اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ

جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچتا ہے

وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ

اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے۔

قَالَ

تو کہتا ہے کہ

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ

اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کئے

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ

اور ایسے نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں۔

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ

اور میری اولاد کو میرے لیے بھلائی کا ذریعہ بنا

اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

سورۃ احقاف - آیت — ۱۵

پاکستان کی عمر کا چالیسواں (۴۰) سال

اور اُس کی دینی و تاریخی اہمیّت

چونکہ ہم بالعموم شمسی تقویم کے عادی ہیں لہٰذا عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۴ر اگست ۱۹۸۵ء کو پاکستان نے اُنتالیسواں یوم استقلال منایا ہے۔ گویا اُس روز اِس نے اپنی عمر کے اڑتیس سال پورے کر کے اُنتالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ہماری دینی تقویم قمری ہے اُس کے حساب سے دیکھا جائے تو کسی قدر مختلف معاملہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کا قیام ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو عمل میں آیا تھا۔ اس طرح ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ کو اُس کی عمر کے اُنتالیس سال پورے ہو گئے ہیں اور اُس نے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ (اور اِن سطور کی تحریر کے وقت اُس چالیسویں سال کے بھی چار ماہ سے زائد گزر چکے ہیں)

انسان کی پختگی کی عمر: چالیس سال

یہ بات تو قرآنِ حکیم کا ہر طالب علم اور دینی مزاج کا حامل ہر شخص جانتا ہے کہ انسانی زندگی میں چالیس سال کی عمر کو خصوصی اہمیّت حاصل ہے اور انسان کی پختگی کی عمر چالیس برس ہے۔ چنانچہ سورۂ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں :

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ بَلَغَ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَۃً ۙ قَالَ ۔ ۔ ۔ (الآیہ)

—— "یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچا اور چالیس برس (کی عمر) کو پہنچ گیا تو اس نے کہا۔ ۔ ۔"

ظاہر ہے کہ اس سے مُراد جسمانی بلوغت نہیں ہے بلکہ شعوری اور نفسیاتی پختگی[1] ہے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں یہ آیۂ مبارکہ نصّ کا درجہ رکھتی ہے۔

آغازِ وحی کی عمر: چالیس سال

اسی طرح اگر اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ "استثنائات کُلّیہ کو ثابت کرتے ہیں[2]" تو سب جانتے ہیں کہ قانونِ قدرت یا سنّت اللہ یہی رہی ہے کہ نبوّت کا ظہور[3] یعنی وحی کا آغاز چالیس برس کی عمر میں ہوتا رہا ہے۔ (اس قاعدہ کُلّیہ سے مستثنیٰ غالباً صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کی تو پوری شخصیّت ہی خرقِ عادت[4] کی حیثیت رکھتی ہے) چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ:

عن ابنِ عباسؓ قال بُعِثَ	——"حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ
رَسُول اللهِ صلّى الله عليهِ وسلّم	سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسُول اللہ
لِاَربَعِينَ سَنَةً فَمَكَثَ	صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث
بِمكّةَ ثَلٰثَ عَشَرَةَ سَنَةً	ہوئے۔ اس کے بعد تیرہ برس مکہ میں مقیم رہے
يُوحىٰ اِلَيهِ ثُمَّ اُمِرَ بِالْهِجْرَةِ	اور آپ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ پھر آپ کو
فَهَاجَرَ عَشرَ سِنِيْنَ وَمَاتَ	ہجرت کا حکم ہوا تو آپ نے ہجرت فرمائی اور
وَهُوَابنُ ثَلٰثٍ وَ سِتِّينَ	دس برس (مدینہ میں مقیم) رہے اور تریسٹھ برس
سَنَةً۔	کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ (اس کو روایت
(بخاریؒ و مسلمؒ)	کیا امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے)

پس ثابت ہُوا کہ از روئے قرآن و حدیث انسان کی عقلی و شعوری بلوغت اور جذباتی و نفسیاتی پختگی کی عمر

---

[1] 'INTELLECTUAL AND PSYCHOLOGICAL MATURITY'

[2] "EXCEPTIONS PROVE THE RULE"

[3] نہ کہ آغاز!!

[4] یعنی عام قوانینِ طبعیہ کے خلاف ہے۔

چالیس سال ہے۔

بنی اسرائیل کی چالیس سالہ صحرانوردی اور چالیس سال کے بعد انقلابِ حال

اب چونکہ افراد ہی سے اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور بقول علامہ اقبال: ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

لٰہذا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ اجتماعیت انسانیہ میں بھی چالیس برس کی مدّت کو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اور قرآن حکیم میں بھی اس کی کم از کم ایک مثال تو نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے چنانچہ سورۃ مائدہ کے چوتھے رکوع میں تفصیلاً مذکور ہے کہ مصر سے 'خروج' (EXODUS) کے کچھ عرصے کے بعد جب بنی اسرائیل کو 'قتال فی سبیل اللہ' کا حکم ہوا اور انہوں نے اس سے پہلوتہی اختیار کی اور اللہ کے دو۲ جلیل القدر پیغمبروں یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام اور اُن کے دو۲ وفادار اور تقویٰ شعار ساتھیوں یعنی یوشع بن نون اور کالب بن یفنا رحمہما اللہ کی کُل تشویق و ترغیب اور فرمائش وفہمائش کے جواب میں بالکل دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ:

"قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝" (المائدہ: ۲۴)

"انہوں نے کہا: "اے موسیٰ ہرگز ہم اس (سرزمین مقدس) میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ (یعنی عمالقہ) وہاں موجود ہیں۔ پس جاؤ تم اور تمہارا ربّ اور تم دونوں جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

تو اس پر ایک۱ جانب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس درجہ بیزاری کی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں اپنی بے بسی کے ذکر کے ساتھ اپنی اُمّت سے قطع تعلق کی اجازت طلب کی:

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۝" (المائدہ: ۲۵)

"موسیٰ نے عرض کیا: اے رَبّ میرے مجھے تو سوائے اپنی جان اور اپنے بھائی کے (اور کسی پر) کوئی اختیار حاصل نہیں ہے پس علیٰحدگی فرما دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے مابین۔"

اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ اگر یہ لوگ بزدلی نہ دکھاتے تو ہم ارضِ مقدس ابھی ان کو عطا فرما دیتے لیکن اُن کے قتال فی سبیل اللہ سے جان چرانے کی بنا پر یہ ارضِ مقدس اُن پر چالیس برس تک حرام رہے گی اور اس عرصے کے دوران یہ اسی صحرائے سینا میں بھٹکتے پھریں گے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

"قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ" (المائدہ: ۲۶)

—— "اللہ نے فرمایا: اب یہ (ارضِ مقدس) ان پر چالیس برس تک حرام رہے گی (اور) یہ زمین میں بھٹکتے (ہی) رہیں گے!

تاریخ بتاتی ہے کہ اسی چالیس سال کے عرصے کے دوران حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت ہارونؑ کا بھی، اور یہ دونوں جلیل القدر پیغمبر اللہ کے دین اور اپنی اُمت کے ارضِ مقدس پر غلبہ و تمکن کو اپنے جسدِ عنصری کی آنکھوں سے دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے! لیکن چالیس برس کی مدت کی تکمیل کے بعد بنی اسرائیل کی اُس نئی نسل نے جو صحرا ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مراحل طے کیے اور اس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے عہدِ زرّیں کے آغاز کی تمہید ہوئی۔

بنی اسرائیل اور اُمّتِ مُسلمہ کے حالات میں عمومی مُشابہت

واضح رہے کہ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جتنے رسول دنیا میں مبعوث ہوئے اتنی ہی مسلمان اُمتیں بھی لازماً وجود میں آئی ہوں گی، خواہ بڑی خواہ چھوٹی، لیکن قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اہم ترین اور قابلِ لحاظ اور قابلِ ذکر اُمتیں دو ہی ہیں: پہلی اُمتِ موسیٰؑ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری اُمتِ محمدؐ یا موجودہ اُمتِ مسلمہ!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جانب خارج سے وارد و واقع ہونے والے حالات و واقعات کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظِ مبارکہ منقول ہیں:

لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ كَمَا —— "میری اُمت پر بھی مصائب و حوادث

اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ	اسی طرح واقع ہوں گے جیسے بنی اسرائیل پر ہوئے
حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ ؕ	بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ
(ترمذیؒ عن عبداللہ بن عمروؓ)	ہوتی ہے "

اور دوسری جانب اُمّت کے داخلی احوال و کوائف اور اعمال[1] و اشغال کے ضمن میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ :

"لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ	"حضورؐ نے فرمایا: تم لازماً ان لوگوں (کے
شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا	طور طریقوں) کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے گزرے
بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ	ہیں، بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ
ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ قِیْلَ:	(کے انداز میں) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے
"یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْیَهُوْدُ	تھے تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے" پوچھا گیا "حضورؐ
وَالنَّصَارٰی ؟" قَالَ: "فَمَنْ ؟"	کیا یہود اور نصاریٰ (مراد ہیں)؟" فرمایا: "تو
(بخاریؒ و مسلمؒ عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ)	اور کون؟"

(اس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا)

واقعہ یہ ہے کہ اِس حدیثِ مبارک کی عظمت اور صدقِ صد حقانیّت کا کسی قدر اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب انسان بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ اُس مفصّل فردِ جرم کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ کی موجودہ دینی و اخلاقی اور ایمانی و عملی حالت کا جائزہ لیتا ہے جو سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع

---

[1] ان سطور کے راقم نے جب اس حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا تو اسے اُمّت کی گزشتہ چودہ سو سالہ تاریخ کے دَوران دُو بار عروج اور دُو ہی بار زوال کا بعینہٖ وہی نقشہ نظر آیا جو بنی اسرائیل کی تاریخ کے خلاصے کے ضمن میں سورہ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اب سے ٹھیک گیارہ سال قبل راقم نے اپنے اسی مُشاہدے، اور غور و فکر کے نتیجے کو میثاق بابت اکتوبر نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع کر دیا تھا اور اب وہ تحریر راقم کی تالیف 'سرافگندیم' میں بطور مقدمہ شامل ہے اور برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے قلم سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی "RISE AND DECLINE OF THE MUSLIM UMMAH" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔

سے شروع ہو کر پندرہویں رکوع کے آغاز تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نظری و فکری، اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی گمراہی ایسی نہیں ہے جو سابقہ اُمّت میں پیدا ہوئی ہو اور موجودہ اُمّتِ مسلمہ اس سے بچی رہ گئی ہو۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے کہ یہ سارا خطاب "درحدیثِ دیگراں" کے انداز میں اصلاً اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام ہی سے ہو رہا ہے!

برِّصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ اور تاریخ بنی اسرائیل کے ابتدائی دَور کے مابین حیرت انگیز مماثلت

متذکرہ بالا کُلّی مشابہت اور مماثلت کے ساتھ ساتھ بعض جزوی مشابہتوں کا معاملہ مزید حیران کُن ہے۔ بالخصوص برِّصغیر پاک و ہند کی مسلمان قوم کی ماضیٔ قریب کی تاریخ اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے موجودہ احوال و کوائف اور تاریخ بنی اسرائیل کے اوّلین دَور کے حالات و واقعات کے مابین جو مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اُس کی تو شاید کوئی دوسری نظیر پُوری انسانی تاریخ میں نہ مل سکے!

بنی اسرائیل کی معجزانہ نجات

سب جانتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے میں آباد ہونے کے بعد کئی صدیوں تک بنی اسرائیل مصر میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد تدریجاً حالات میں انقلاب آیا اور اُن پر شدائد و مصائب کے اس دَور کا آغاز ہو گیا جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت سے متصلاً قبل اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اُس زمانے میں جن حالات سے دوچار تھے اُن کی تعبیر قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر قلیل فرق و تفاوت کے ساتھ ان الفاظ میں ہوئی ہے:

"يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝" (البقرہ: ۴۹)

"وہ چکھاتے تھے تمہیں بدترین عذاب کا مزہ (یہاں تک کہ) ذبح کر ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں یقیناً تمہارے لیے تمہارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی۔"

(واضح رہے کہ سورۃ اعراف کی آیت نمبر ۱۴۱ میں بھی یہ الفاظ مبارکہ جُوں کے تُوں وارد ہوتے ہیں، صرف

اس ایک فرق کے ساتھ کہ "یُذَبِّحُوْنَ" کی بجائے "یُقَتِّلُوْنَ" کا لفظ استعمال ہُوا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت ہی اللہ تعالیٰ کے اِس ارادے اور مشیّت کے ساتھ ہوئی تھی کہ اُن کے ذریعے بنی اسرائیل کو اس عذاب سے نجات دلائی جائے چنانچہ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ — "اور ہم چاہتے تھے کہ احسان فرمائیں ان
اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ — لوگوں پر جنہیں زمین میں دبا لیا گیا تھا اور بنا دیں
وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ — ان ہی کو سربراہ اور بنا دیں ان ہی کو (زمین کا)
الْوٰرِثِيْنَ" (القصص ۵) — وارث!"

اور اگرچہ آنجناب کی بعثت کے مقاصد میں وہ جملہ امور بھی لازماً شامل تھے جن کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث کیے گئے یعنی دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس' تاہم آپؑ کی بعثت کا ایک خصوصی مقصد بنی اسرائیل کی نجات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد فرعون سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے یہ مطالبہ پیش فرما دیا کہ:

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ — "ہم دونوں تمہاری جانب تمہارے رَبّ
مَعَنَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ — کے پیغامبر ہیں پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ
وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (طٰہٰ: ۴۷) — جانے دو اور اُن کو مت ستاؤ!"

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر اور فرمائش و فہمائش پر فرعون اور آلِ فرعون کی جانب سے کیا ردِّ عمل ظاہر ہُوا۔ اور کس طرح "تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ" (بنی اسرائیل: ۱۰۱) یعنی نَو عظیم معجزات دیکھنے کے باوجود ع "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کے مصداق نہ صرف یہ کہ اُن کے کفر و اعراض اور تعلّی و استکبار میں اضافہ ہوتا چلا گیا بلکہ خود بنی اسرائیل پر اُن کے تشدّد کی شدّت بڑھتی چلی گئی۔ بہرحال یہ طویل داستان جس نتیجے پر منتج ہوتی وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے پے بہ پے معجزات کے ذریعے نجات عطا فرمائی۔ چنانچہ اُن کی نگاہوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے عصا کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹا جس سے اُن کے بچ نکلنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ پھر عین اُن کی نگاہوں کے سامنے اُن کا دشمن پُورے لاؤ لشکر سمیت غرق ہُوا، پھر عصا کی ایک ہی ضرب سے ایک چٹان سے اُن کے لیے پانی کے بارہ چشمے پھُوٹ نکلے' بے آب و گیاہ بیابان میں اُن کے لیے مَن و سلویٰ

کی صورت میں غذا نازل فرمائی گئی، انہیں دھوپ کی شدت و تمازت سے بچانے کے لیے غمام کا اہتمام کیا گیا۔ بعد ازاں الواح کی صورت میں تورات عطا فرمائی گئی اور اُس کی پیروی اور شریعت کی پابندی کا عہد و میثاق لیتے ہوئے کوہِ طور کو ان کے سروں پر معلّق کر دیا گیا۔

ابتدائی کم ہمتّی اور بعد کی عزیمت کا سبب

موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مصر میں آلِ فرعون کے ساتھ خود بھی "تِسۡعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ" کا مشاہدہ بچشمِ سر کر چکنے اور پھر سفرِ ہجرت کے دوران متذکرہ بالا جملہ آیات و معجزات کا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ کر چکنے کے باوجود بنی اسرائیل نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبرؑ اور اپنے عظیم نجات دہندہ کے ساتھ مسلسل نافرمانی اور اذیّت رسانی کا وہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جس پر رسولؑ کو یہ فریاد کرنی پڑی کہ:

"یٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُوۡنَنِیۡ ——" اے میری قوم کے لوگو! مجھے کیوں اذیت
وَقَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ پہنچا رہے ہو در آں حالیکہ تم خوب جانتے ہو کہ
رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ ۔" (الصف: ۵) میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں۔"

اِس لیے کہ اُن کے اسی طرزِ عمل کا نقطۂ عروج ہے وہ واقعہ جس کا آغاز میں ذکر ہو چکا ہے یعنی حضرت موسیٰؑ کی تمام تر ترغیب و تحریض اور فرمائش و فہمائش کے باوجود "قتال فی سبیل اللہ" سے اعراض و انکار جس کی پاداش میں اُن پر چالیس سالہ صحرا نوردی مسلّط کر دی گئی چنانچہ وہ چالیس برس بیابانِ سینا ہی میں (IN THE WILDERNESS OF SINAI) بھٹکتے رہے اور "یَتِیۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ" کی مناسبت سے اُس کا نام ہی "صحرائے تیہ" پڑ گیا۔ پھر اسی مسئلے کا تتمّہ یا تکملہ ہے یہ سوال کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اسی قوم کی اگلی نسل میں اتنی ہمّت و عزیمت پیدا کر دی اور اُس کی اِس درجہ کایا پلٹ کر رکھ دی کہ اس کے باوجود کہ وہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السّلام ایسے جلیل القدر پیغمبروں کی صحبت و معیّت سے محروم ہو چکے تھے اور ان کی سربراہی و رہنمائی کے فرائض وہ شخص ادا کر رہا تھا جس کی نبوّت اور رسالت کا کوئی صریح ثبوت کم از کم قرآنِ حکیم میں موجود نہیں ہے۔ (یعنی حضرت یوشع بن نون) تاہم انہوں نے اس کی سرکردگی میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل بحسن و خوبی طے کیے چنانچہ وہ ارضِ مقدس جو چالیس برس تک کے لیے ان پر حرام کر دی گئی تھی، اُن کے ہاتھوں فتح ہوئی اور اُن کے دورِ غربت کا خاتمہ اور دورِ

عروج کا آغاز ہو گیا؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ کی معیّت میں مصر سے نکلے تھے، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلامی کی چکّی میں پِستے رہنے کے باعث بزدل اور بودے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک جانب اُن میں سے اکثر کی غیرت وحمیّت کچلی جا چکی تھی اور دوسری جانب وہ عزیمت ومقاومت سے عاری اور تہی دست ہو چکے تھے۔ اور ماضیٔ قریب کی شدید ترین تعذیب (PERSECUTION) نے تو گویا اُن کے حوصلے اور قوتِ ارادی کا جنازہ نکال دیا تھا، چنانچہ وہ مصر میں شدید ترین محنت ومشقت تو کرتے تھے لیکن خود اپنے عزم وارادے کی اساس پر نہیں بلکہ آلِ فرعون کے کوڑوں اور ڈنڈوں کے خوف سے۔ اِس کے برعکس بنی اسرائیل کی جس نسل نے جہاد وقتال کی پُرعزیمت راہ اختیار کی وہ، وہ تھی جو آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور اسی فضا میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی چنانچہ اُن میں غیرت وحمیّت کے اوصاف بھی پیدا ہوئے اور عزتِ نفس اور خودداری کے احساسات بھی۔ اور اِس سونے پر سہاگے کا کام کیا صحرا کی پُرصعوبت زندگی نے جس سے اُن میں سخت کوشی اور جفاکشی کی عادت پیدا ہوئی اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

مسلمانانِ ہند پر انگریز کی دوسو سالہ غلامی کے اثرات

ان حقائق کی روشنی میں اب ذرا غور کیجئے مسلمانانِ ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر!

صنم خانۂ ہند میں اسلام کا ورودِ اوّل ۷۱۲ء میں ہوا اور اُس وقت سے لے کر ۱۷۵۷ء تک یعنی ایک ہزار سال سے زائد عرصہ برِّصغیر پر مسلمانوں نے جزوی یا کلّی طور پر حکومت کی! اس کے بعد لگ بھگ دوسو برس انگریز کی غلامی میں گزرے اور اس دوصد سالہ غلامی کے دَوران برِّصغیر کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی کم وبیش آٹھ اور بعض علاقوں میں لگ بھگ چھ نسلیں بیت گئیں اور کیسے ممکن تھا کہ اس کے اثرات ونتائج کا ظہور نہ ہوتا۔

یہ دُرست ہے کہ ان دوسو برسوں کے دَوران انگریز کی جانب سے بڑے پیمانے پر ظلم وتشدّد، قتل وغارت اور لوٹ مار کا معاملہ تو ایک ہی بار ہوا یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد —

اس سے قبل کے سو سالہ دَور میں یا میدانِ جنگ میں کھلے مقابلے کا معاملہ رہا یا میدانِ سیاست کے دجل و فریب، بدعہدی و بے وفائی اور مکاری و دسیسہ کاری کا۔ اور بعد کے نوّے سالوں کے دَوران بھی اگرچہ دینی حمیت اور جذبۂ حریت سے سرشار بے شمار مسلمان، بالخصوص علمائے کرام، قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے، جیل خانوں میں تعذیب و تشدد کا نشانہ بنتے، پھانسی کے پھندوں میں جھولتے یا حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں پاتے نظر آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اُن کی کُل تعداد ہندوستان کے مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں بنتی۔ تاہم عہدِ حاضر کے اس بدترین استعمار نے ایک جانب مسلمانانِ برصغیر کی بحیثیتِ مجموعی غیرت و حمیت اور خودداری و عزتِ نفس کو کچلنے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کیے جو ہمیشہ سے استعماری قوتوں کا معمول رہے ہیں۔ یعنی:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ج (النمل: ۳۴)

——— یقیناً بادشاہ جب کسی بستی (یا ملک) میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کر دیتے ہیں اور اس کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں۔

جس کی بہترین تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اِن اشعار میں: ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ 'اِنَّ الْمُلُوْكَ' | سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر | پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری!

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز | دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری،

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکُن | تا تراشی خواجہ ئے از برہمن کافر تری!

نتیجۃً ان دو سو سالوں کے دَوران ع "حمیّت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے" کے مصداق اسلامیانِ ہند کا جو فرد یا گروہ غیرت و حمیت اور عزتِ نفس کے اعتبار سے جتنا 'ہلکا' ہوتا چلا گیا اتنا ہی اُوپر اُٹھتا اور سرکار دربار میں 'باعزت' بنتا چلا گیا اور جن کے قدموں میں غیرت و حمیت کی بیڑیاں رہ گئیں، وہ معاشرتی و معاشی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتے چلے گئے۔ اور دوسری جانب عہدِ حاضر کے اس فرعونِ جدید نے "يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ" کی ایک نئی اور بظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر لیکن حقیقتاً حد درجہ مؤثر اور تیر بہدف صورت اختیار کی۔ یعنی ایک نئے نظامِ تعلیم

کے ذریعے انگریزی زبان اور مغربی تہذیب و تمدّن کی ترویج اور اس 'ثقافتی انقلاب' کے ذریعے نئی نسلوں کا اپنے ماضی سے کامل انقطاع جو قومی و ملّی سطح پر قتلِ عام سے ہرگز کم نہیں اور گویا "یُقَتِّلُونَ اَبْنَآءَکُمْ" کی جدید اور مہذّب صورت ہے۔ بقول اکبرالٰہ آبادی مرحوم ؎

یُوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی!

قومی و اجتماعی سطح پر اِس 'کردارکشی' کا جو نتیجہ نکلا اُسے کسی صاحبِ درد نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

مَیں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر تم نے اَسلاف کی عزّت کے کفن بیچ دیئے!
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!

اور اِس جلتی آگ پر تیل کا کام کیا "آزادیٔ نسواں" کی اُس تحریک نے جس نے ہمارے عائلی و سماجی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، خاندان کے مقدّس ادارے کی چولیں ہلا دیں، شرم و حیا کا دیوالہ نکال دیا اور عصمت و عفّت کے معیارات ختم کر دیئے۔ اور اس طرح گویا "وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ" کی ایک جدید تفسیر عملاً پیش کر دی۔

پنجاب اور سرحد کا اضافی المیہ

اس اعتبار سے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وسطی پنجاب اور اس سے ملحقہ صوبہ سرحد کے علاقے کے مسلمان ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی بدقسمت اور مظلوم ثابت ہوئے اس لیے کہ اُن پر انگریزوں کی غلامی سے متصلاً قبل، اوّلاً سکھوں کی دہشت گردی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری اور بعدازاں باضابطہ "سکھا شاہی" مسلط رہی جو یقیناً "یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ" کی بدترین صورت تھی۔ نتیجۃً ایک طرف تو اُن کی خودی اور عزتِ نفس زیادہ ہی پامال ہوئی۔ اور اُن کی غیرت و حمیت کچھ زیادہ ہی مجروح ہوئی اور دوسری طرف انہوں نے انگریز کی آمد کو غنیمت جانا اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا اور اس طرح ع "کہ خود نخچیر کے دِل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!" کی صورت پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس علاقے کے مسلمانوں نے اوّلاً ۱۸۵۷ء میں انگریز کی مدد کی اور اُن ہی کی مدد سے انگریزوں نے دوبارہ دہلی کو فتح کیا اور ثانیاً یہاں کے 'اعلیٰ' طبقات نے انگریز کے 'ثقافتی انقلاب' کا دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ ہی دِلی آمادگی سے خیر مقدم کیا اور ان کے دِلوں میں انگریز کے خلاف نفرت و بغاوت کے وہ جذبات کبھی پیدا نہ ہو سکے جو بقیہ ہندوستان کے اُن مسلمانوں کے دِلوں

میں پیدا ہوئے جن سے انگریز نے براہِ راست حکومت چھینی تھی۔

ہندوؤں کی جانب سے انتقامی طرزِ عمل کا اندیشہ

مزید غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہندوستان کی مسلمان قوم کا المیہ دوہرا تھا۔ اس لیے کہ جہاں ایک جانب انگریز کی غلامی کے نتیجے میں اُن کی غیرت و حمیّت ہمت و عزیمت اور خودی و عزّتِ نفس کے سوتے خشک ہو رہے تھے وہاں دوسری جانب اُن ابنائے وطن کے دلوں میں اُن کے خلاف نفرت و انتقام اور بُغض و عداوت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے جن پر اُنہوں نے ہزار سال سے زائد عرصہ تک حکومت کی تھی۔ نفرت و انتقام کے اس جذبہ کو اوّلین شہ تو اگرچہ بیرونی استعمار ہی سے ملی تھی لیکن بعد ازاں یہ خود ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اس کی جڑیں زمین میں بہت گہری اُتر گئی تھیں اور آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل تو یہ جذبۂ نفرت و انتقام ایک خوفناک عفریت کی مانند چنگھاڑتا ہوا بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ مسلمانانِ ہند اپنے ابناءِ وطن کے مقابلے میں تعداد کے اعتبار سے تو ایک تہائی تھے ہی، تعلیم و تنظیم اور سرمایہ و وسائل کے اعتبار سے بھی بہت پیچھے تھے۔ نتیجۃً ایک شدید خوف اور سراسیمگی کی حالت اُن پر طاری ہو گئی تھی۔

پاکستان کا معجزانہ قیام اور معجزے کا فوری سبب

ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ برِّصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت کا بیک وقت انگریزوں کی بالفعل موجود اور ہندوؤں کی ممکنہ و قابلِ حذر غلامی سے نجات پا کر ایک آزاد اور خود مختار ملک کا مالک بن جانا اور دنیا کے نقشے پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا دفعۃً ظہور ہرگز ایک معجزے سے کم نہ تھا اور یہ معجزہ بھی، جیسے کہ ہم ان شاء اللہ بعد میں تفصیلاً واضح کریں گے صرف ایک ہی واقعہ کے معجزانہ ظہور کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے متذکرہ بالا 'سلسلۂ معجزات' کے مانند متعدد معجزات کا مجموعہ ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے اِس سوال کا جواب بھی سامنے آ جانا چاہیے کہ یہ معجزہ کیوں رُونما ہُوا ہے جن لوگوں کی نگاہیں "يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (الروم: ۷) کے مصداق صرف ظاہر تک ہی محدود رہتی ہیں اور جن کا غور و فکر حیاتِ دنیوی اور نظامِ کائنات گویا آفاق و انفس کے ضمن میں صرف مادّی اسباب و علل اور اِن کے نتائج و عواقب ہی تک محدود رہتا ہے انہیں تو شاید

یہ بہت دُور کی کوڑی نظر آئے لیکن جو اِس نظامِ عالم کے 'باطن' سے بھی کسی قدر شناسا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ پُورا سلسلۂ اسباب ایک مُسبّب الاسباب تبارک وتعالیٰ کے ارادہ و مشیّت کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے وہ اگر قرآنِ حکیم کی آیات بینات پر غور کریں تو اس حقیقت کو پالیں گے کہ یہ اللہ عزوجل کی سنّتِ ثابتہ رہی ہے کہ جب کوئی فرد اور بالخصوص کوئی قوم اللہ سے کوئی وعدہ کرتے ہوئے کسی چیز کا سوال کرتی ہے تو اللہ اُسے وہ چیز عطا فرما کر ایک موقع ضرور عنایت فرماتا ہے کہ وہ اپنے قول کی صداقت اور وعدے کی سچائی ثابت کر سکے۔

قومی و اجتماعی سطح پر تو اس سنّت اللہ کی جانب واضح اشارہ تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن ہی میں موجود ہے۔ چنانچہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۹ میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل ہوا ہے:

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ	— "قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو
عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ	ہلاک کردے اور تمہیں زمین میں خلافت عطا
فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ	فرما دے۔ اور پھر دیکھے کہ تم کیا روش اختیار
تَعْمَلُوْنَ ۝	کرتے ہو!"

اور شخصی و انفرادی سطح پر منافقین مدینہ کے ایک گروہ کے رویّے کے ضمن میں اِس سنّت اللہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی آیات ۷۵، ۷۶ میں مذکور ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ	— "اُن میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں
لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ	نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے
لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ	فضل سے (دولت) عطا فرمائے گا تو ہم خوب
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ فَلَمَّآ	خیرات کریں گے اور لازماً نیک لوگوں میں سے
اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ	ہوجائیں گے پھر جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل
بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ	سے نوازا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور رُخ
مُّعْرِضُوْنَ ۝	موڑ لیا پہلوتہی کرتے ہوئے۔

خوب اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ قیامِ پاکستان کا معجزہ بھی اسی سُنّت اللہ کے تحت ظاہر ہُوا۔ اِس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے عوامی اور جذباتی دَور میں جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء

دوسالوں پر مشتمل ہے پورا برصغیر از درۂ خیبر تاراس کماری اور از مکران تا چاٹگام اِس نعرے سے گونج اٹھا تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الاّ اللہ" اور تحریک کے زعماء و عمائد کے صریح اور بہانگِ دہل اعلانات و بیانات پر مستزاد جمعہ اور عیدین کے عظیم اجتماعات میں کروڑوں مسلمانوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں اور عہد کیا تھا کہ اے اللہ! ہم اِس دوہری غلامی سے نجات پا کر صرف تیرے بندے بن کر رہیں گے اور تیرے اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دین پر عمل پیرا ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اسی عہد و میثاق کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا رُخ بدل گیا، کایا پلٹ کر رہ گئی اور زنجیریں کٹتی چلی گئیں۔ بقول اقبال ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

قیامِ پاکستان کے بعد کا طرزِ عمل

ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا آزادی کے بعد کا طرزِ عمل بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کے طرزِ عمل سے بہت مشابہ و مماثل ہے۔ نتیجۃً جس صورتِ حال سے وہ دوچار ہوئے اور جس کیفیت میں وہ تا حال مبتلا ہیں وہ بھی نہ صرف بنی اسرائیل کے مشابہ و مماثل بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بدتر اور مایوس کُن ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی آزمائش تو بڑی کڑی تھی اِس لیے کہ انہیں 'مُلک' کے حصول کیلئے جنگ کی دعوت دی گئی تھی جس پر اُن کی کئی سو سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور 'بزدلی' کی صورت میں ہوا۔ یہاں بغیر جنگ و قتال دو وسیع و عریض خطوں پر مشتمل ایک عظیم الشان مملکت عطا فرما دی گئی تھی اور اب ف اپنے قول کی صداقت اور وعدہ کی سچّائی ثابت کرنے کی ضرورت تھی لیکن افسوس کہ یہاں دو صد سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور 'وعدہ خلافی' کی صورت میں ہوا۔ اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان بحیثیتِ مجموعی اپنی تمام دعاؤں اور التجاؤں اور درخواستوں اور عرضداشتوں کو بھُلا کر اور کُل عہد و میثاق اور قول و قرار کو فراموش کر کے آزادی کے مادّی ثمرات اور دنیوی انعامات سمیٹنے کے ضمن میں تکاثر و تنافس اور مقابلہ و مسابقت کی دَوڑ میں مگن ہی نہیں گم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ یہاں سزا بھی دوہری ملی۔

بے یقینی اور بے مقصدیت کا صحرائے تیہ

ایک بے یقینی اور بے مقصدیت کے 'صحرائے تیہ' میں سرگردانی کی کیفیت جس کی شدّت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا اور تا حال ہو رہا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان دولخت ہوا اور نہ صرف یہ کہ

مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیٰحدہ ہوا بلکہ اُس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا اور اس طرح گویا اپنے تعارف و تشخص ہی کو بدل ڈالا اور اپنے ماضی سے کم از کم وقتی طور پر لاتعلقی اختیار کر لی۔ اور یہ بھی اسی کا مظہر ہے کہ تا حال یہ دونوں خطّے ملّی قومی اور سیاسی و دستوری سطح پر عدمِ توازن اور عدمِ استحکام کا شکار ہیں اور فانیؔ کے اس شعر کا مصداق کامل بنے ہوئے ہیں کہ ؎

ہم تو فانیؔ جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

یا اس شعر کا کہ ؎ سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم!

چنانچہ ایک طرف اپنا حال یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اغراض و مقاصد ہی بحث و نزاع کا موضوع اور اختلاف و انتشار کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں بڑوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل حیران و پریشان ہے کہ 'پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا تھا؟' اور 'آیا اُس قافلۂ ملّی کی کوئی منزلِ مقصود تھی بھی یا نہیں جس نے پاکستان حاصل کیا؟' بلکہ یہاں تک کہ 'آیا تقسیمِ ہند کا کوئی جواز تھا بھی کہ نہیں؟' نتیجتہً ملّی و قومی سطح پر ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں چنانچہ زعماء و قائدین اور اصحابِ فکر و دانش تک کی سعی و جہد اور تگ و تاز کا حال اِس مصرعہ کا مصداق ہے کہ ع "آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!" تو بے چارے عوام کا کیا قصور اگر وہ اس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہوں کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں

اور اس صورتِ حال کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں بھی ریاست کے دستورِ اساسی کے اعتبار سے 'سلطنتِ خداداد پاکستان' "ہنوز روزِ اوّل است" کا نقشہ پیش کر رہی ہے اور اس شعر کی مصداقِ اتم ہے کہ ؎

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اِس فکر میں غنچے سُوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہو گا؟ دستورِ بہاراں کیا ہو گا؟

اور دوسری طرف اغیار پھبتیاں چُست کر رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان تا حال کسی تشخص کی تلاش میں ہے[ل]

[ل] "(PAKISTAN IS STILL IN SEARCH OF AN IDENTITY.)"

اور کوئی فیصلہ صادر فرمادیتا ہے کہ پاکستان اپنا جواز کھو چکا ہے[1]۔ اور کوئی اس سے بھی آگے بڑھ کر فیصلہ کُن انداز میں پیشگوئی کر دیتا ہے کہ پاکستان ٹوٹنے ہی والا ہے اور اس کے حصے بخرے ہونے ہی والے ہیں[2]۔

نفاقِ عملی اور پستیٔ کردار

دوسری سزا جس سے ملّتِ اسلامیہ پاکستان اس وقت دوچار ہے وہ یہ کہ ایک قلیل اقلیت کو چھوڑ کر پوری قوم "نفاقِ عملی" کی اُس کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ان احادیثِ مبارکہ میں سامنے آتا ہے۔

۱۔ "عن ابی هریرهؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلّم "اٰیة المنافق ثلاث": زاد مسلمٌ، وإن صامَ وصلّی وزعمَ انهٗ مسلمٌ ثمّ اتفقا "اذا حدّثَ کذبَ واذا وعدَ أخلفَ واذا ائتُمِنَ خانَ" (بخاریؒ ومسلم)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "منافق کی نشانیاں تین ہیں"۔ یہاں امام مسلمؒ نے مزید الفاظ روایت فرماتے ہیں کہ "خواہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو"۔ اس کے بعد بخاریؒ اور مسلمؒ کے متفق علیہ الفاظ ہیں کہ: "جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے"!

۲۔ وعن عبدالله ابن عمروؓ قال قال رسوْل الله صلی الله علیه وسلّم: اَربعٌ مَن کُنَّ فِیهِ کانَ مُنافِقًا خالِصًا ومَن کانَتْ فِیهِ خَصلَةٌ منهن کانت فِیهِ خَصلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں اسی کی نسبت سے نفاق ہوگا۔ یہاں

---

[1] "(PAKISTAN HAS LOST ITS RATIONALE)"

[2] "PAKISTAN IS AT THE VERGE OF DISINTEGRATION OR FURTHER BALKANISATION"

حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔" (متفق علیہ)

تک کہ اسے چھوڑ دے۔ جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے جب عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب (کسی سے) جھگڑے تو آپے سے باہر ہو جائے۔"

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ہم قومی و ملی سطح پر اخلاق کا دیوالہ نکل جانے کی کیفیت (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ آٹے میں نمک کی حیثیت کے حامل افراد کو علیحدہ رکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی سطح پر صداقت و امانت اور شرافت و مروت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اور ایفائے عہد اور پاسِ امانت کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔ انفرادی اعتبار سے خالص خود غرضی اور عریاں مفاد پرستی کا دَور دورہ ہے اور قومی مصالح اور ملی مفادات سے کسی کو کوئی غرض نہیں رہی۔ معاملات میں بدعہدی اور بددیانتی بلکہ باضابطہ مکاری اور چالبازی کی گرم بازاری ہے۔ تجارت اور لین دین میں دھوکے اور فریب سے بھی بڑھ کر کھانے پینے کی چیزوں حتّٰی کہ ادویات تک میں ملاوٹ گویا معمولی بات بن کر رہ گئی ہے۔ سرکاری محکموں اور دفتروں میں رشوت ستانی کا بازار تو گرم ہے ہی باضابطہ اذیت رسانی اور لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا تفریح اور مشغلے کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور معاشرتی اور سماجی سطح پر سنگدلی اور سفاکی نے ڈیرے جما لیے ہیں تو سیاسی و حکومتی سطح پر بھی جھوٹ اور وعدہ خلافی نے 'ORDER OF THE DAY' کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا اور حساس شخص حیران و پریشان ہے کہ ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

نفاقِ عملی کا سبب اور اس کا قابلِ حذر انجام

"نفاقِ عملی" کی یہ کیفیت جس کا ہلکا سا نقشہ سطور بالا میں کھینچا گیا ہے براہِ راست نتیجہ ہے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کا۔ چنانچہ اس سے قبل سورۃ توبہ کی آیات ۷۵، ۷۶ کے حوالے سے نفاق کی جس خاص قسم کا ذکر ہوا ہے اُس کے بارے میں آیت نمبر ۷۷ میں صراحت موجود ہے کہ یہ بدعہدی کی سزا کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ۔

—— "تو اللہ نے سزا کے طور پر اُن کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک کے لیے جب وہ اس کے حضور حاضر ہوں گے بہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے۔

اِس آیۂ مبارکہ میں ایک لرزہ طاری کر دینے والی وعید بھی ہے کہ "یہ نفاق اب اس دن تک قائم رہے گا جس دن یہ لوگ اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے"۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں یاس اور ناامّیدی کے گھٹاٹوپ اندھیرے نگاہوں کے سامنے چھا جاتے ہیں۔ اور اس ضمن میں اس سے بھی بڑھ کر لرزہ انگیز ہے اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۱۰، وَھِیَ ھٰذِہٖ:

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ

—— "نفاق کی جو عمارت ان لوگوں نے تعمیر کر لی ہے اب یہ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اِلّا یہ کہ اُن کے دل (خود) ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

اور اس سے ذہن بے اختیار منتقل ہو جاتا ہے اُن متذکرہ بالا پیشگوئیوں کی طرف جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں دُنیا کے بہت سے سیاسی تجزیہ نگار کر رہے ہیں کہ یہ اپنی یک جہتی اور سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور مستقبل قریب میں مزید حصّے بخرے ہونے کے عمل (BALKANISATION) سے دوچار ہو جائے گا۔ (اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِكَ، اے اللہ! اے ہمارے رب! ہمیں اس انجام سے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ)

الغرض، بے یقینی اور بے مقصدیت کے دھندلکوں پر انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے اس دیوالیہ پن اور نفاقِ عملی کے گھٹاٹوپ اندھیروں نے بالکل "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ"[1] کی کیفیت

---

[1] سورۂ نور آیت نمبر ۴۰۔ ترجمہ "اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اُوپر تہ در تہ۔

پیدا کر دی ہے اور ملک و ملت کے مستقبل کو نہایت تاریک بنا کر رکھ دیا ہے اور حالات وواقعات کے اس 'صغریٰ' کو قوموں کے عروج و زوال کے ضمن میں قدرت کے اٹل اصولوں اور اسباب و علل اور عواقب و نتائج کے باہمی لزوم کے 'کبریٰ' کے ساتھ جوڑ کر قیاس کیا جائے تو حاصل سوائے مایوسی اور ناامیدی کے اور کچھ نہیں بنتا۔ اور حساب کتاب کے کسی بھی قاعدے سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔

پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال اور اُمّید کی ایک کرن

یاس و نومیدی کی اس شدت کے عالم میں، حال ہی میں، راقم الحروف کے شعورِ باطنی کے پردے پر، چالیس سال کی مدت کے حوالے سے امید کی ایک کرن جگمگائی ہے اور اس اچانک انتقالِ ذہنی نے کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان نے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل کے متذکرہ حوالے کے ناطے میرے نہاں خانۂ قلب میں امید کا ایک چراغ روشن کر دیا ہے۔ اور اس خیال نے زور باندھا ہے کہ ہماری بھی وہ نئی نسل جو قیامِ پاکستان کے بعد آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور آزادی ہی کی فضا میں پروان چڑھی، تا آنکہ اب شعوری پختگی کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور اگرچہ فی الوقت اپنے بڑوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی و فکری کے باعث "زوالِ علم و عرفاں" سے بھی دوچار ہے اور ان ہی کی کوتاہیٔ عمل اور نقضِ میثاق سے پیدا شدہ صورتِ حال کی بنا پر اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی قابلِ رشک حالت میں نہیں ہے۔ تاہم غلامی کے منحوس اثرات سے بہر حال محفوظ رہی ہے لہٰذا غیرت و حمیّت اور جرأت و ہمت کے اعتبار سے یقیناً پچھلی نسل سے بہتر حالت میں ہے نہ "ندرتِ افکار" سے بالکل تہی دست ہے نہ "جرأتِ کردار" سے محرومِ محض۔ اگر کسی طرح اسے بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا جائے اور اُس منزل کی از سرِ نو نشاندہی کر دی جائے جس کے حصول کے لیے آج سے نصف صدی قبل برِصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ نے سفر کا آغاز کیا تھا تو کیا عجب کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کی عمر کا یہ چالیسواں سال ایک فیصلہ کُن موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت حاصل کر لے اور ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو" کے مصداق بے یقینی اور بے مقصدیت کے 'صحرائے تِیہ' میں بھٹکنے والا یہ قافلہ بھی از سرِ نو مقصد و منزل کا سُراغ پا کر ایک عزمِ تازہ اور ولولۂ نَو کے ساتھ ع "ہوتا ہے جادہ پیما

پھر کارواں ہمارا، کی شان سے سرگرم سفر ہو جائے!

میرے دل میں دفعۃً جگمگانے والی اُمید کی اِس روشنی کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے قرآن حکیم ہی کے ایک مقام سے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ لوگوں کے کان کھول دیں اور ڈنکے کی چوٹ فرمادیں کہ اگر تم اپنے اعراض و انکار کی موجودہ روش پر قائم رہے تو عذابِ الٰہی لازماً آکر رہے گا۔ اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ گھڑی آیا ہی چاہتی ہے اور عذاب بالکل تمہارے سروں پر آچکا ہے یا ابھی کچھ دُور ہے اور حکمتِ خداوندی اور مشیّتِ ایزدی میں ابھی تمہارے لیے کچھ مزید مہلت باقی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَ اِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ۝	—— پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ صاف کہہ دیں کہ میں نے تم سب کو برابر خبردار کر دیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب الٰہی) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل قریب ہے یا (ابھی کسی قدر) دُور ہے۔
(الانبیاء: ۱۰۹)	

اور۔

وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ۝	—— اور میں نہیں جانتا شاید کہ یہ (مہلت) تمہارے لیے مزید ایک آزمائش اور ایک وقت معیّن تک مزید فائدہ اُٹھا لینے کا موقع ہو۔
(ایضاً: ۱۱۱)	

گویا عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ابھی ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی مزید مہلت عطا کرے اور اصلاحِ احوال اور تلافیٔ مافات کا ایک اور موقع عنایت فرمائے تا آنکہ وہ صورت پیدا ہو جائے کہ:

لِيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ ؕ	—— تاکہ جسے مرنا ہے وہ مرے (لیکن) قیامِ حجّت کے بعد اور جسے جینا ہے وہ جیئے (لیکن) حجّت (اور بصیرت) کے ساتھ!
(الانفال: ۴۲)	

لیکن اِس کے لیے لازم ہے کہ حقائق کا جرأت کے ساتھ سامنا کیا جائے، ماضی کا بے لاگ

جائزہ ہو اور گزشتہ ناکامیوں اور نامرادیوں کے اسباب و علل کا بھرپور اور امکانی حد تک معروضی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ضمن میں نہ کسی کے ادب و احترام کو حائل ہونے دیا جائے نہ کسی کی محبت اور عقیدت کو آڑے آنے دیا جائے، بہر حال کے عوارض و امراض کی صحیح اور گہری تشخیص کی جائے اور اس سارے مواد کو سامنے رکھ کر ایک حقیقت پسندانہ لائحۂ عمل تیار کیا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے۔

چنانچہ اسی مقصد کے تحت راقم الحروف نے پیشِ نظر تحریر کو سپردِ قلم کرنے کا ارادہ کیا تھا اور خاص اسی مقصد کے لیے اُس نے حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ آج ۲ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ کو بمقام طائف اِس طویل تحریر کا مقدمہ مکمل ہو گیا۔

اللہ گواہ ہے کہ اِس سے نہ کسی کی دل شکنی و دل آزاری مقصود ہے نہ کسی کی توہین و تنقیص اور نہ کسی گزری ہوئی شخصیت پر سبّ و شتم مطلوب ہے نہ کسی حاضر و موجود شخصیت کی کردار کشی! بلکہ مقصود صرف اور صرف اصلاح ہے، اپنی امکانی حد تک۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ	—— میرا کوئی ارادہ نہیں ہے سوائے اصلاح
مَا اسْتَطَعْتُؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ	کے، جس حد تک میرے امکان میں ہو، اور نہیں
اِلَّا بِاللّٰهِؕ (ھود: ۸۸)	حاصل ہے مجھے کوئی توفیق مگر صرف اللہ ہی کے سہارے

تتمّہ

دو باتیں اچانک یاد آئیں:

ایک یہ کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ و قدس سرہٗ العزیز کے بعد جن علماء کرام کو پاک و ہند میں شہرت حاصل ہوئی، اُن میں سے جامع معقول و منقول —————— اور جامع شریعت و طریقت ہونے کے اعتبار سے اہم ترین اور منفرد ہستی، یعنی مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی رحؒ نے اپنی یگانۂ روزگار تالیف "النبی الخاتم" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں یومِ طائف کو 'فیصلہ کن موڑ' (TURNING POINT) قرار دیا ہے۔ کیا عجب کہ اِس تحریر کے اِس سرزمین پر سپردِ قلم کیے جانے کے پسِ پردہ بھی کوئی راز ہو!

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ: ۲۱۶) ——— اور اللہ (ہر چیز) جانتا ہے جبکہ تم (کچھ بھی) نہیں جانتے۔

° دوسری یہ کہ آج سے ٹھیک بیس سال قبل نومبر ۱۹۶۵ء میں والدِ محترم مرحوم کے انتقال (بتاریخ ۱۱ نومبر) سے پیدا شدہ رنج اور صدمے سے نڈھال ہو کر طبیعت کی بحالی کے لیے راقم نے وادیٔ کاغان کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر راقم ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم تھا کہ اچانک خیال آیا کہ آج ۲۶ نومبر ہے گویا بڑے بھائی صاحب کی اُنتالیسویں سالگرہ یا عمرِ فانی کے چالیسویں سال کا پہلا دن! اس پر ذہن بے اختیار سورۂ احقاف کی محولہ بالا آیت نمبر ۱۵ کی جانب منتقل ہُوا اور میں نے بھائی صاحب کے نام وہیں سے ایک خط ارسال کیا جس میں اِس آیت مبارکہ کو "ہدیۂ اخلاص" کے طور پر پیش کیا۔ (بعد ازاں میں نے اِس آیت مبارکہ کی خوبصورت کتابت کرائی اور اسے 'میثاق' میں بھی ایک سے زائد بار شائع کیا اور بہت سے رفقاء و احباب کو بھی جو چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ ہوتے تھے 'ہدیۃً پیش کیا')

آج ٹھیک بیس سال بعد راقم اِس آیت مبارکہ کو ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں اُس کی عمر کے چالیسویں سال کے آغاز کے موقع پر پیش کر رہا ہے ع

گر قبول افتد زہے عزّو شرف!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

طائف، ۲ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ

چند ذاتی وضاحتیں

آگے بڑھنے سے قبل دو باتیں بطور تمہید عرض کرنی ہیں جن کی حیثیت 'ذاتی وضاحتوں' (POINTS OF PERSONAL EXPLANATION) کی ہے:

پہلی یہ کہ میرے بارے میں یہ بات عام طور پر بھی مشہور ہے اور خود میں نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا ہے کہ میں معروف معنی اور مروجہ مفہوم کے اعتبار سے ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں چنانچہ میں نے جو دو تنظیمی ہئیتیں قائم کی ہیں ان میں سے ایک یعنی انجمن خدام القرآن کے بارے میں بھی سب جانتے ہیں کہ وہ ایک خالص علمی و تعلیمی اور تدریسی و تربیتی ادارہ ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت کے ضمن میں بھی اس کا کُل مرکز و محور قرآن حکیم ہے پھر اس کا نام خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ کوئی سیاسی جماعت تو کیا سرے سے جماعت ہی نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک انجمن (SOCIETY) ہے اور اس کی سرگرمیوں کا مظہرِ اتم 'قرآن اکیڈمی' ہے جو معروف معنی میں صرف ایک 'ادارہ' (INSTITUTION) ہے۔ اسی طرح 'تنظیم اسلامی' کے نام سے میں نے جو 'جماعت' قائم کی ہے وہ اگرچہ محدود معنی میں انجمن یا ادارہ نہیں ہے بلکہ باضابطہ 'جماعت' ہے لیکن اس کا بھی یہ پختہ فیصلہ ہے کہ وہ کبھی ملکی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ لہٰذا یہ بھی مروجہ مفہوم کے اعتبار سے سیاسی جماعت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ مارشل لا کے ساڑھے آٹھ سالہ دور میں نہ اس پر کوئی پابندی لگی نہ اس کی سرگرمیوں پر کوئی روک ٹوک ہوئی۔

اس پس منظر میں جب پیشِ نظر تحریر میں بعض سیاسی امور پر تفصیلی گفتگو لوگوں کے سامنے آئے گی تو اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو 'تضاد' (CONTRADICTION) کا احساس ہو۔

اس کا اصل سبب یہ ہے کہ 'سیاست'، اگرچہ فی الاصل ایک نہایت وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح

ہے لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کا ایک ہی محدود مفہوم رائج ہے ۔ یعنی انتخابات میں حصّہ لے کر حکومت کے حصول یا اُس پر اثر انداز ہونے کی کوشش ۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ پوری دنیا میں یہ امر مسلّم ہے کہ صحافت سیاست کا اہم ترین شعبہ ہے ۔ اِس لیے کہ یہ رائے عامّہ کو ایک خاص رُخ پر ہموار کرتی ہے جس کا براہِ راست اثر انتخابات پر پڑتا ہے تاہم مروّجہ معنی میں صحافیوں کو سیاسی آدمی کہیں بھی قرار نہیں دیا جاتا ۔ اِس اشکال کو اس طرح بآسانی حل کیا جاسکتا ہے کہ سیاست کو دو شعبوں میں منقسم سمجھا جائے ۔ ایک نظری یا بالواسطہ سیاست اور دوسرے عملی یا براہِ راست سیاست ان میں جہاں تک مؤخر الذکر یعنی عملی سیاست کا تعلق ہے اس نے عہدِ حاضر اور بالخصوص مغربی ممالک میں ایک پیشہ (PROFESSION) کی حیثیت اختیار کر لی ہے لہٰذا یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ صرف پیشہ ور سیاستدانوں کی جولانگاہ ہے لیکن جہاں تک مقدم الذکر یعنی نظری سیاست کا تعلق ہے تو کم از کم نظری اعتبار سے یہ ہر باشعور انسان کے لیے لازمی ہے اس لیے کہ ملک اور قوم کے معاملات پر غور و فکر اور ان کو درپیش مسائل کے لیے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دامے، درمے سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرضِ عین ہے اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بدعہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے ۔ یہ نظری یا بالواسطہ سیاست کس قدر اہم اور مؤثر بلکہ فیصلہ کن ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ماضی قریب میں یورپ کے ممالک اور زمانۂ حال میں امریکہ میں یہودیوں کے عمل دخل سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اپنی تعداد کی قلت کے باعث وہ براہِ راست عملی سیاست میں دخیل نہیں ہو سکتے لیکن ذرائع ابلاغ پر اپنے قبضہ و تسلّط کے ذریعے وہ امریکہ جیسے عظیم ملک کی سیاست کو کنٹرول کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بقول اقبال ؒ

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

مزید غور کیا جائے تو 'عملی سیاست' کے بھی دو مختلف انداز ممکن ہیں : ایک کو 'انتخابی سیاست' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور دوسرے کو 'انقلابی سیاست' سے ۔ اِن دونوں کے مابین حدِّ فاصل اِس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر کسی انسان کے نزدیک اُس کے ملک میں قائم معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام (POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM) بحیثیتِ مجموعی اور اپنی جڑ بنیاد کے اعتبار سے صحیح

ہے تو ملک و قوم کی بہتری کے ضمن میں صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اُس نظام کو چلانے کے لیے بہتر سے بہتر ہاتھ فراہم کیے جائیں اور اس میں زیادہ سے زیادہ کچھ جزوی اور فروعی پالیسیوں کے ضمن میں اختلاف واقع ہوسکتا ہے' اس صورت میں ضرورت صرف اس کی ہوگی کہ 'انتخابی سیاست' میں حصّہ لے کر صرف 'حکومت' کی تبدیلی کی کوشش کی جائے۔ اِس کے برعکس اگر کسی کے نزدیک ملک میں بالفعل قائم و رائج نظام بحیثیتِ مجموعی غلط اور بلحاظ اساس نظری باطل (FALSE) اور باعتبارِ تشکیل عملی مبنی بر امتیازات (DISCRIMINATIVE) ہے' یا ظالمانہ اور متشدّدانہ (UNJUST AND EXPLOITATIVE) ہے' یا استحصالی ہے' تو اس کے لیے مسئلہ صرف 'حکومت' کی تبدیلی کا نہیں ہوگا بلکہ پورے نظام کی تبدیلی کا ہوگا جس کے لیے انتخابی سیاست قطعاً غیر مفید اور بالکل لاحاصل ہے۔ اس کے لیے اصلاً ایک انقلابی عمل درکار ہوگا جسے ہم 'انقلابی سیاست' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

اَلحَمدُ لِلّٰہ کہ گزشتہ نصف صدی کے دَوران بہت سے اربابِ دانش اور اصحابِ قلم کی کاوش و محنت کے نتیجے میں یہ حقیقت تو کم از کم تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے بالکل نکھر کر آچکی ہے کہ اسلام صرف ایک 'مذہب' نہیں بلکہ ایک کامل 'دین' ہے اور اس میں جہاں 'مذہب' کے جملہ معروف اجزاء یعنی 'عقائد' عبادات اور بعض معاشرتی رسُومات موجود ہیں وہاں انسان کی اجتماعی زندگی کے وہ تینوں گوشے بھی شامل ہیں جن کو موجودہ دنیا میں عام طور پر حیاتِ انسانی کے 'لادینی میدان' (SECULAR FIELD) سے تعبیر کر دیا جاتا ہے یعنی ایک مکمل اور متوازن معاشرتی نظام' ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشی نظام اور ایک مساویانہ اور حریّت پرور سیاسی نظام۔ اب اگر واقعہ یہ ہے کہ سیاست اسلام کا جزو ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی ہو۔

علاّمہ اقبال مرحوم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا: "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" راقم کے نزدیک ان الفاظ میں بھی، غالباً وزن و بحر کی مجبوریوں کے باعث، حقیقت کی تعبیر میں کسر رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سیاست کوئی بالاتر اور عظیم تر حقیقت ہے اور دین اس کا ایک جزو' جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کم از کم اسلام کی حد تک اصل بالا و برتر اور جامع و غالب حقیقت 'دین' ہے اور 'سیاست' محض اس کا ایک شعبہ اور جزو ہے جو تمام تر دین کے تابع ہے۔ البتہ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ شعبہ یا جزو بھی ہرگز نہ غیر اہم ہے نہ حقیر اس لیے کہ ایک حدیث

نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام کے مطابق سابقہ اُمّتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل میں سیاست کی پوری ذمّہ داری خود انبیاء کرام علیہم السلام کے کندھوں پر رہی۔ ("کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِیَاءُ" رواہ مسلم) اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مغربی مفکّرین اور مصنّفین میں سے بعض نے فی الواقع تحسین وستائش کے انداز میں اور بعض بدبختوں نے ہجو ملیح کے انداز میں تسلیم کیا ہے کہ آپؐ نہایت ماہر اور عظیم سیاستدان (STATESMAN) تھے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کے مشہور ترین عالمِ فلسفۂ تاریخ ٹائن بی (TYONBEE) نے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا سہرا ہی تمام تر آپؐ کی سیاستدانی (STATESMANSHIP) کے سر باندھا ہے (ورنہ نقل کفر کفر نباشد۔ اُس کے نزدیک بحیثیت نبی تو آپؐ ناکام ہو گئے تھے)![1] اسی طرح پروفیسر منٹگمری واٹ نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاستدانی، امورِ حکومت کی واقفیت ومہارت، معاملہ فہمی و موقع شناسی، دُور اندیشی و پیش بندی، انتظام وانصرام اور پیشگی اہتمام اور بروقت اقدام کو شاندار خراجِ تحسین ادا کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس ضمن میں تحسین وستائش کا کوئی لفظ اور اسلوب ایسا نہیں رہا، جو اُس نے استعمال نہ کر لیا ہو۔ اگرچہ اُس نے بھی نہایت لطیف (SUBTLE) انداز میں 'مکہ والے محمدؐ' (MOHAMMAD AT MAKKAH) اور مدینہ والے محمدؐ' (MOHAMMAD AT MADINA) کے مابین تضاد (CONTRAST) پیدا کر کے ایک ہجو ملیح کی صورت پیدا کی ہے۔ اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ سچائی، اور راست بازی کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر جامع اور حقیقت سے نزدیک ترین انداز ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کا ہے جو انہوں نے اپنی تالیف "THE 100" میں اختیار کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نسلِ آدم کی عظیم ترین شخصیت قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپؐ نسلِ انسانی کی واحد شخصیت ہیں جو بیک وقت مذہب اور سیاست کے دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب ہیں![2]"

---

[1] ("Mohammad failed as a PROPHET but succeeded as a Statesman.")

[2] "My Choice of Mohammad to lead the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was THE ONLY man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."
("The 100' page 33.)

بنابریں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی 'باشعور اُمتی' کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ خالص 'غیر سیاسی' انسان ہو۔ چنانچہ الحمدللہ کہ شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک راقم کی زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جو خالص غیر سیاسی حالت میں گذرا ہو۔ ایک ہائی سکول کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے اپنی بساط کے مطابق تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا، پھر ۴۷ء تا ۵۷ء جماعت اسلامی کی تحریک سے عملاً منسلک رہا، جبکہ جماعت مروجہ معنی کے اعتبار سے بھی ایک سیاسی جماعت قرار پاچکی تھی۔ اُس سے علیٰحدگی اختیار کی تو اِس بنیاد پر کہ پاکستان میں اسلام 'انتخابی سیاست' کے ذریعے نہیں بلکہ صرف 'انقلابی عمل' کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ دن اور آج کا دن میری توانائیوں اور صلاحیتوں حتیٰ کہ میرے اوقات کا بھی بہتر اور بیشتر حصہ 'اسلامی انقلاب' کے اساسی لوازم (BASIC PREREQUISITES) کی تکمیل کی سعی وجہد میں صرف ہوا ہے۔ اور اس دوران میں بھی میں نے کم از کم نظری و فکری سطح پر وقتی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔ چنانچہ تحریر اور تقریر دونوں کے ذریعے امکانی حد تک قوم اور ملک کو درپیش مسائل کے ضمن میں اپنی رائے کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

قصہ مختصر یہ کہ میں 'خالص غیر سیاسی' آدمی کبھی نہیں رہا اگرچہ مروجہ انتخابی سیاست کے میدان سے ضرور کوسوں دُور بھاگتا ہوں۔

دوسری تمہیدی وضاحت یہ کہ میرے بارے میں یہ بات بھی بالعموم معلوم ومشہور ہے کہ ماضی میں میرا نہایت گہرا تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ رہا ہے۔ چنانچہ خود میں نے بھی نہ صرف یہ کہ کبھی اسے چھپایا نہیں بلکہ بارہا اس کا ڈنکے کی چوٹ اور علیٰ رؤس الاشہاد اعتراف واعلان کیا ہے کہ اگرچہ میرے شعور کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح پر تو نقش ہیں علامہ اقبال مرحوم ومغفور کی ملی شاعری کے اثرات تاہم میرے ذہن اور فکر کی تفصیلی تشکیل میں سب سے زیادہ دخل جماعتِ اسلامی کے دینی فکر اور مولانا مودودی مرحوم و مغفور اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف کو حاصل ہے۔ اُدھر جماعتِ اسلامی کا تحریکِ پاکستان سے تعلق ایک اختلافی اور نزاعی مسئلہ ہے اور اگرچہ جماعت کے زعماء وعمائدین بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ جماعت کبھی پاکستان کی مخالف نہیں رہی بلکہ بعض سادہ لوح بزرگ تو اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر گزرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے ضمن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد سب سے بڑھ کر حصہ مولانا مودودی کا ہے

لیکن عام طور پر یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی اور ان دعووں کی یا تو شدت کے ساتھ تردید کی جاتی ہے۔ یا کم از کم انہیں مسکرا کر یا ہنس کر ٹال دیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں فی الوقت میں اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ اصل معاملہ کیا ہے بلکہ صرف یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ تقسیم ہند سے قبل میرا جماعتِ اسلامی کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہیں تھا بلکہ میں اپنی عمر اور بساط کے مطابق عملاً تحریکِ پاکستان ہی کا ایک ادنیٰ کارکن اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ورکر اور عہدیدار تھا۔ اور اگرچہ میں اُس وقت بھی اپنے محدود فہم کی حد تک جماعتِ اسلامی کی تحریک اور مولانا مودودی کے فکر سے متعارف ہو چکا تھا۔ اور مجھے اُس کے ساتھ ایک گونہ اتفاق اور کسی قدر ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ جب مسلم لیگ اور فیڈریشن کے حلقوں میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو میں اُن کی جانب سے اپنے اِمکان بھر مدافعت بھی کرتا تھا تاہم میرا عملی تعلق کُل کا کُل تحریکِ مسلم لیگ اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ تھا۔

اِس سلسلے میں میں بعض واقعات کو ریکارڈ پر لے آنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا بچپن مشرقی پنجاب (اور اب بھارت کے صوبہ ہریانہ) کے ایک ضلع 'حصار' میں گزرا ہے۔ جو متحدہ پنجاب کے پسماندہ ترین اضلاع میں سے تھا۔ اور جس کا اکثر و بیشتر حصّہ کچھ عرصہ قبل دریائے گھگھر کے خشک ہو جانے کے بعد صحرا کی صورت اختیار کر چکا تھا اور میری یادداشت کے مطابق پورا ضلع اکثر قحط و خشک سالی کا شکار رہتا تھا اور اس کی بنا پر آفت زدہ علاقہ (CALAMITY STRICKEN AREA) قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے تقاوی قرضوں کی صورت میں کاشتکاروں کی مدد کا سلسلہ عموماً جاری رہتا تھا۔ تعلیمی اعتبار سے بھی پورے ضلع کی پسماندگی کا عالم یہ تھا کہ اُس کے طول و عرض میں کالج صرف ایک تھا اور وہ بھی قصبہ بھوانی کے مالدار بنیوں کا قائم کردہ ہندو قومی کالج۔ پورے ضلع میں ہائی سکول بھی میرے اندازے کے مطابق آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہوں گے جن میں دو تین ہندوؤں کے قومی سکول تھے بقیہ سب گورنمنٹ سکول تھے۔ چنانچہ حصار ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بھی کُل کی کُل ہائی سکول کے طلبہ پر مشتمل تھی اور میں نویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے اُس کا جنرل سیکرٹری تھا، اور نہ صرف یہ کہ اپنے قصبے یعنی حصار میں اِس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا تھا بلکہ اکثر سرسہ اور ہانسی کے قصبات کے دوروں پر بھی جاتا رہتا تھا۔ اِس ضمن میں اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جو تاریخی جلسہ منعقد ہوا تھا جس سے قائدِ اعظم مرحوم نے خطاب فرمایا تھا اس میں ضلع حصار کے دو مندوبین میں سے ایک مَیں تھا (دوسرے دسویں جماعت کے طالب علم عبدالواحد تھے، جن کے بارے میں اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں) مجھے خوب یاد ہے کہ اس موقع پر ہمارے قیام کا انتظام میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک سے متصل ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا جس کے اور میکلوڈ روڈ کے مابین ایک خالی پلاٹ تھا جس میں بانسوں کا بہت بڑا سٹاک تھا۔ اگر فیڈریشن کا اُس دَور کا ریکارڈ کہیں محفوظ ہو تو اس میں اُس اجلاس کے ضلعی مندوبین کی حیثیت سے شرکت کرنے والے طلبہ کے پاسپورٹ سائز کے فوٹو جو پہلے ہی طلب کر لیے گئے تھے ضرور موجود ہوں گے اور اُن میں ایک تصویر اس خاکسار کی بھی ہو گی۔

قصّہ مختصر یہ کہ قبل از آزادیٔ ہند جماعتِ اسلامی کا تحریکِ پاکستان کے ساتھ تعلق مثبت تھا یا منفی، اس سے قطع نظر راقم کو اس پر فخر ہے کہ تحریکِ پاکستان کے ننھے کارکنوں میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ اور یہ کیسے نہ ہوتا جبکہ راقم کے شعور کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح پر، جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سب سے گہرے اور انمٹ نقوش ثبت تھے مصوّرِ پاکستان علاّمہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری کے۔

ساتھ ہی یہ عرض کر دوں کہ پاکستان میں آزادی کے بعد سے اب تک جو حالات رُونما ہوئے اُن کی بنا پر کبھی کبھی مایوسی کی شدّت کے عالم میں دوسرے بہت سے لوگوں کے مانند میرے ذہن وشعور کے سامنے بھی یہ سوالیہ نشان اُبھرا کہ پاکستان کا قیام درُست اقدام تھا بھی کہ نہیں ہے، لیکن الحمدللہ کہ ہمیشہ صورت یہ رہی کہ جب بھی مَیں نے از سرِ نو صغریٰ کبریٰ جوڑ کر حساب لگایا نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ پاکستان کا قیام صحیح اور درُست تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں ہم سے اجتماعی سطح پر کوتاہی کا صدور ہوا جس کی سزا ہمیں پہلے بھی بھگتنی پڑی اور تاحال بھی بھگتنی پڑ رہی ہے۔

اِس ضمن میں یادش بخیر، پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کی مثال بہت اہم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ علاّمہ اقبال کے مصاحبین اور تحریکِ پاکستان کے شعلہ بیان مقررین میں نہایت اہم مرتبہ ومقام کے حامل تھے اور خود اُن کے قول کے مطابق قائدِ اعظم سے اُن کا قریبی تعلق تھا اور اُن کے اور متعدد مسلمان والیانِ ریاست کے مابین نجی پیغام رسانی اور چندوں کی رقوم کی ترسیل کا ذریعہ وہ تھے۔ اِسی طرح از پشاور تا پُونا جہاں بھی کبھی کوئی انتخابی معرکہ گرم ہوتا تھا اُن کو طلب کیا جاتا تھا۔ اُن کی ’لیگیت‘ کی شدّت کا اندازہ اِس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو خود انہوں نے بیان فرمایا کہ ایک موقع پر سیالکوٹ کے کسی دینی جلسے

میں وہ بھی بحیثیت مقرر مدعو تھے اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی۔ اور اتفاقاً دونوں کا قیام کسی ایک ہی مکان میں تھا۔ مولانا مدنیؒ کو جب معلوم ہوا کہ چشتی صاحب بھی وہیں پر مقیم ہیں تو انہوں نے چشتی صاحب کو پیغام بھجوایا کہ وہ اُن سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ لیکن اس پر چشتی صاحب کا جواب یہ تھا کہ میرے اور آپ کے راستے بالکل جدا بلکہ متضاد سمت میں ہیں لہٰذا میں آپ سے ملاقات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہی پروفیسر یوسف سلیم چشتی پاکستان میں پیش آمدہ حالات و واقعات سے اس درجہ مایوس اور دل گرفتہ ہوئے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد سے تو میں خود گواہ ہوں کہ اپنے انتقال کے وقت تک وہ برملا اس رائے کا اظہار کرتے رہے کہ ع "مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی" کے مصداق پاکستان کا قیام ہی غلط تھا۔ اور یہ کہ "ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ دے کر جھک ماری اور بھاڑ جھونکا" میرا چونکہ پروفیسر صاحب مرحوم کے ساتھ بھی گہری نیازمندی کا تعلق رہا ہے بلکہ منظرِ عام سے ایک طویل عرصہ کی 'غیبوبت' کے بعد پبلک پلیٹ فارم پر اُن کا ظہور میری ہی قائم کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی سالانہ کانفرنسوں کے ذریعے ہوا تھا۔ اور مجھے اس اعتراف میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ میں نے اُن کے علم و فضل اور خصوصاً اُن کے وسیع خزانۂ معلومات سے بہت استفادہ کیا اور اُن کے لیے میرے دل میں آج بھی ادب اور احترام بلکہ احسان مندی کے جذبات پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ تاہم قیامِ پاکستان کے ضمن میں اُن کی رائے کی تبدیلی اور اُس میں اس قدر شدت میری دانست میں ہرگز درست نہیں تھی بلکہ اُن کے مزاج کی اسی جذباتیت اور حساسیت کا مظہر تھی جو بالعموم شدتِ اخلاص کا نتیجہ ہوتی ہے البتہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شان میں اپنے مزاج کی اسی جذباتیت کے باعث جن گستاخیوں کا ارتکاب اُن سے مسلم لیگ کے ساتھ عملی وابستگی کے دوران ہو گیا تھا اُن پر اُن کی پشیمانی اور توبہ و استغفار یقیناً درست تھا۔ اس لیے کہ محض سیاسی اختلاف پر کسی کے خلوص و اخلاص پر حملہ کرنا بالخصوص مولانا مدنیؒ ایسی عظیم دینی و روحانی شخصیت کی شان میں گستاخی کا ارتکاب یقیناً بہت بڑی غلطی تھی۔ چنانچہ اس موضوع پر اُن کی ایک طویل تحریر جسے مولانا مدنیؒ کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھنے والے جرائد بھی شائع کرنے میں متامل و متردد تھے اولاً میں نے ہی 'میثاق' (شمارہ جنوری ۷۲ء) میں شائع کی تھی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب پر تو قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات و واقعات کی بنا پر مایوسانہ ردِّ عمل کی کیفیت مستقل طور پر قائم ہو گئی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے مخلص اور بے لوث کارکنوں میں ایسی

اور بھی بہت سی مثالیں لازماً موجود ہوں گی لیکن جہاں تک مختلف مواقع پر عارضی مایوسی اور بد دلی کا تعلق ہے تو اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ سے بھی بہت سے مایوسانہ اقوال منسوب کیے جاتے ہیں، اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کے عہدِ حکومت میں فروری ۱۹۶۶ء میں عید کے چاند کے ضمن میں جو اختلاف اور اس سے پیدا شدہ ہنگامۂ دار و گیر برپا ہوا تھا، اُس کے موقع پر خود راقم نے مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم ایسے کٹر مسلم لیگی کی زبان سے یہ الفاظ جامعہ اشرفیہ لاہور کے ایک اجتماع میں سُنے تھے کہ "اب جو حالات پیش آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ غالباً اُن علماءِ کرام کی رائے زیادہ دُرست اور صائب تھی جو قیامِ پاکستان کے خلاف تھے"!

اِس ضمن میں ہر اعتبار سے 'آخری' مثال پروفیسر مرزا محمد منوّر کی ہے جو از سرتا پا، از ظاہر تا باطن اور از اوّل تا آخر خالص مسلم لیگی اور پاکستانی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جو حالات و واقعات پاکستان میں رونما ہوئے اُن سے وہ بھی وقتی طور پر اِس درجہ مایوس اور دلگیر ہوئے کہ انہوں نے ایک فارسی غزل لکھی جس کا عنوان ہی یہ تھا کہ ؏

کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد

اس غزل کو راقم نے اوّلاً اگست ۱۹۷۰ء کے 'میثاق' میں شائع کیا تھا اور بطور قندِ مکرّر دوبارہ ۱۹۸۲ء میں یعنی ٹھیک بارہ سال بعد شائع کیا۔ اپنی اس غزل پر ایک تعارفی نوٹ بھی مرزا صاحب نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا۔ ملاحظہ ہو:

"غزل کا پس منظر سیاسی ہے۔ برِصغیر تقسیم ہوا۔ بڑی نیک خواہشات کے ساتھ مسلم قوم نے تقسیم کی تحریک کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ مگر بوجوہ نتائج حسبِ تمنا برآمد نہ ہوئے جب بھی کوئی بہتری کی صورت پیدا ہوئی ساتھ ہی ساتھ کوئی خرابی بھی در آئی۔ اے کاش! قائدِ اعظم کی طرح کا کوئی "مردِ امین" پھر مل جاتا۔ منوّر"

غزل خاصی طویل تھی لیکن اُس کا لُبِّ لباب اِن اشعار میں سامنے آجاتا ہے کہ ؎

چہ دار دسعی ما سُودے نمی یابیم مقصودے
کہ برگ و خس بیا وردیم و شاخِ آشیاں گم شد

خنک روزے بود یا بیم اگر خضرِ ہدایت را
کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد!![1]"

الغرض! ملّتِ اسلامیہ پاکستان گزشتہ ۳۸، ۳۹ سالوں کے دَوران 'صحرائے تیہ' میں بھٹکنے کی جس کیفیت سے دوچار رہی ہے اُسی کی بنا پر بہت سے مخلص لوگوں کے دلوں میں تو مایوسی کے شدید اندھیارے مستقل طور پر مسلط ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ شدید ردِّ عمل کا شکار ہو کر رہ گئے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے دِلوں پر مختلف مواقع پر عارضی طور پر بد دلی کی کیفیت طاری ہوتی رہی جس کے منحوس اثرات سے وہ اپنے آپ کو بدقّتِ تمام ہی بچا سکے! ۔ اور ان مؤخر الذکر لوگوں میں ان سطور کا عاجز و حقیر راقم بھی شامل ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی تو ملّتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں موجودہ پوری عالمی اُمّتِ مسلمہ کے مستقبل سے شدید مایوسی ہو جاتی ہے اور ایسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید سات آٹھ صدیوں بعد تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے والی ہے اور ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

کے مصداق قدرت ایک بار پھر پوری موجودہ اُمّتِ مسلمہ کو 'رَد' کر کے اسلام کا جھنڈا کسی نئی قوم کے ہاتھوں میں تھمانے والی ہے۔ کبھی پھر اُمید کا دامن ہاتھ میں آجاتا ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے بہتری کی توقع قائم ہو جاتی ہے! اب بھی حقیقت یہ ہے کہ جب بھی نگاہ حالات و واقعات کی جانب اُٹھتی ہے مایوسی اور نااُمیدی کی شدّت کے باعث اُمید کا دامن ہاتھ سے بالکل ع "کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!" کی سی کیفیت کے ساتھ چھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب ذہن ارادہ و مشیتِ ایزدی کے مظہر خرقِ عادت واقعات کی ایک مسلسل زنجیر کی جانب منتقل ہوتا ہے تو اُمید کے نئے چراغ دل میں روشن ہو جاتے ہیں اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ پاکستان کا ظہور اسلام کے اُس عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے طویل المیعاد سلسلے کی اہم کڑی ہے جس کی خبر جناب صادق و مصدوق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دی تھی!

---

[1] ہماری سعی و کوشش کا کیا حاصل! کہ پوری کوشش کے باوجود ہم اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر پاتے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم آشیانہ بنانے کے لیے تنکے اور پتے جمع کرتے ہیں تو اس شاخ ہی کو گم پاتے ہیں جس پر آشیانہ تعمیر کرنا تھا۔ وہ دن کتنا دلفریب ہو گا جب ہمیں کوئی خضرِ ہدایت میسر آئے گا کیونکہ اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے یقین کا رہوار صحرائے گماں میں گم ہو چکا ہے۔

گویا اِن سطور کا ناچیز راقم اپنے شعور کے بالکل آغاز ہی سے 'پاکستانی' ہے۔ اور عارضی اور وقتی طور پر پے در پے مایوسیوں اور نا امیدیوں سے دوچار ہونے کے باوجود آج بھی پاکستان کے تابناک مستقبل اور شاندار تقدیر (DESTINY) پر یقین رکھتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اُس منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ملّتِ اسلامیہ پاکستان اور بالخصوص اُس کی نوجوان نسل کو شدید محنت و مشقّت اور پیہم جدوجہد کرنی ہوگی اور سخت ابتلا و امتحان اور ایثار و قربانی کے مراحل طے کرنے ہوں گے۔ بقولِ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ؎

بقدر الکدِّ تکتسبُ المعالی
ومن طلب العلیٰ سَہِر اللّیالی
ومن طلب العلیٰ من غیر کدٍّ
اضاع العُمُرَ فی طلب المحالِ

منظر و پس منظر

چند تلخ، مگر سنگین حقائق

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

باب اوّل
پاکستان کا عدمِ استحکام
حقیقی اور واقعی یا وہمی وخیالی

باب دوم
پاکستان کی اساس

باب سوم
استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بنیاد

باب چہارم
کون سا اسلام؟

باب پنجم
موجودہ مسلمان معاشرے کا
اسلام کے ساتھ حقیقی تعلّق

پاکستان کا عدمِ استحکام

حقیقی و واقعی یا وہمی و خیالی ؟

عالمی سطح پر پاکستان کا شمار بالعموم غیر مستحکم یا بالقوہ مائل بہ انتشار خطوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر زائرنگ جو طویل عرصے تک پاکستان میں مقیم رہے اور پاکستان کے اعلیٰ ترین سرکاری تربیتی ادارے (اسٹاف کالج لاہور) سے وابستہ رہے، اُن کا ایک مضمون غیر ملکی جرائد کے حوالے سے پاکستان کے اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے برملا اور واشگاف الفاظ میں اِن خیالات کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان تاحال اپنے جداگانہ تشخص کا جواز ثابت نہیں کر سکا ہے لہٰذا عنقریب مزید حصے بخرے ہونے کے عمل سے دوچار ہو جائے گا! ۔ اعاذنا اللہ من ذٰلِک!!

اِدھر داخلی طور پر ایک جانب تو بانیٔ پاکستان کا یہ جُملہ تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلسل نشر ہوتا ہے کہ "پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے!" اور دوسری طرف صورتِ واقعی یہ ہے کہ ذرا ہوا تیز چلتی ہے تو پاکستان کی کشتی ہچکولے کھانے لگتی ہے اور سیاسی حالات میں ذرا مد و جذر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو خواص و عوام سب کے ذہن ہی نہیں زبان تک پر یہ سوال آ جاتا ہے کہ "پاکستان باقی بھی رہے گا یا نہیں ؟"

لہٰذا اِس امر کا پوری حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آیا پاکستان کا مبینہ عدمِ استحکام حقیقی اور واقعی ہے یا ع "یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی!" کے مصداق محض دشمنوں کی اِس سازش کا مظہر ہے کہ اِس طرح پاکستان کی مسلمان قوم کے دِلوں میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے اِجتماعی قوتِ ارادی (COLLECTIVE WILL) کو مضمحل کیا جائے!

راقم کے تجزیے کے مطابق پاکستان کا عدمِ استحکام وہمی و خیالی نہیں حقیقی و واقعی ہے اور

اِس کے دلائل اور شواہد ہمارے ماضی اور حال دونوں میں جا بجا موجود ہیں۔ اور جہاں تک "پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے" یا اِس قسم کے دوسرے اقوال کا تعلق ہے تو یہ اگرچہ ؎ "تری آواز مکّے اور مدینے" کے مصداق نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے ایک ایک مسلمان کے دِل کی تمنّا اور آرزو ہے لیکن اِس معاملے میں حقائق کا انداز بالکل قرآن حکیم کے الفاظِ مبارکہ "تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ" کا سا ہے! (سورۃ بقرہ، آیت ۱۱۱: "یہ اُن کی خواہشات ہیں، کہیے پیش کرو اپنی دلیل اگر تم سچّے ہو!")

تو آیئے کہ ذرا اُن حقائق کا جائزہ لیں!

۱۔ سانحۂ مشرقی پاکستان

سب سے پہلی تلخ حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں عالم وجود میں آیا تھا اب کہاں ہے؟ اُس نے تو چودہ سال قبل داستانِ پارینہ کی صورت اختیار کر لی تھی اور اب اُسے "PAKISTAN THAT WAS!" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو اِس "جو تھا نہیں ہے" پر "جو ہے نہ ہوگا!" کو کس دلیل سے بعید از قیاس قرار دیا جا سکتا ہے؟[۱]

یاد کیجیے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحہ پر صرف ملّتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں پورا عالمِ اسلام ہِل کر رہ گیا تھا۔ اور جہاں پوری اُمّتِ مسلمہ پر سکتہ ساطاری ہو گیا تھا وہاں لاکھوں انسان دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ یہاں تک کہ حرمین شریفین کی فضا لوگوں کی آہ و بکا اور نالہ و شیون سے گونج اُٹھی تھی۔ اِس لیے کہ اُس موقع پر صرف یہی نہیں ہوا تھا کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو گیا تھا، اگر بات صرف اتنی ہوتی تو اتنا عظیم صدمہ نہ ہوتا۔ بلکہ اِس علیحدگی کے جلو میں اُس بدترین شکست کا کلنک کا ٹیکہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی پیشانی پر لگا تھا جسے تاریخِ عالم کی عظیم ترین ہزیمتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے، خلافت کی منسوخی اور عالمِ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اغیار کے غلبہ و تسلط میں جکڑے جانے کے جو کچوکے اُمّتِ مرحومہ کو لگے تھے، اُس کے درد و الم میں صدی کے وسطی حصے میں مختلف ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کی کامیابی سے کچھ کمی آئی ہی تھی اور زخم کچھ مندمل ہوئے ہی تھے کہ ۱۹۶۷ء میں دُوَلِ عرب کی شرمناک

---

[۱] ؎ "جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ" اقبال

اور ذلت آمیز شکست اور پھر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں دُنیا کی عظیم ترین مسلمان مملکت کی رُسوا کن ہزیمت نے زخموں کو از سرِ نو تازہ ہی نہیں مزید گہرا کر دیا۔ اور ان زخموں پر نمک چھڑکنے کی خدمت ہمارے اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے اِس طرح سرانجام دی کہ اپنا نام ہی بدل ڈالا اور 'پاکستان' کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اُتار کر خلیج بنگال میں پھینک دیا اور اس طرح اپنی کم از کم گذشتہ پینسٹھ سال کی تاریخ سے اعلان برأت کر دیا (واضح رہے کہ مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ہی میں عمل میں آیا تھا) اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ 'بنگلہ دیش' کے پہلے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کمال حسین نے اعلان کیا کہ "اگرچہ آبادی کے لحاظ سے اِس وقت دُنیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد بنگلہ دیش میں ہے لیکن ہم بنگلہ دیش کو ایک 'مسلمان ملک' کہلوانا پسند نہیں کریں گے" اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ! گویا کم از کم وقتی طور پر تو پاکستان ہی سے نہیں اسلامی تشخص سے بھی بیزاری پیدا ہو گئی تھی !

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بقا اور تسلسل کے لیے ذہنِ انسانی میں نسیان اور بھول کا حفاظتی آلہ (SAFETY VALVE) لگا رکھا ہے۔ ورنہ ع "یادِ ماضی عذاب ہے یا رب! چھین لے مجھ سے حافظہ میرا !" کے مصداق زندگی اجیرن ہو جاتی، اس لیے کہ اب بھی جب کبھی خیال آ جاتا ہے کہ ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوان اُن ہندوؤں کے قیدی بن گئے تھے جن پر ہم نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی تو دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور خصوصاً جب وہ نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ پاکستان کی فوج اور دیگر سروسز کے جوانوں اور افسروں کو بالکل بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ٹرکوں پر لاد کر مشرقی پاکستان سے وسطی ہند (مدھیہ پردیش) کے نظر بندی کے باڑوں (CONCENTRATION CAMPS) تک لے جایا گیا تھا تو دِل خون کے آنسو روتا ہے اور رنج و الم کی کوئی حد نہیں رہتی ——— ایک مختصر سی جنگ کے نتیجے میں اتنی بڑی شکست اور خصوصاً اتنی ذلت و رُسوائی کی تاریخِ انسانی میں کم از کم راقم کی معلومات کی حد تک تو صرف ایک ہی مثال ملتی ہے اور وہ ہے چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی اور اُس کے بعد چھ لاکھ یہودیوں کا بھیڑوں اور بکریوں کے گلّوں کے مانند ہانک کر بابل لے جایا جانا' راقم کے نزدیک ہمارا المیہ اُس سے ہرگز کم نہیں اس لیے کہ اُن چھ لاکھ میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے

اور بوڑھے بھی تھے اور جنگ کے قابل مردوں کی تعداد ہرگز ایک لاکھ سے متجاوز نہیں ہو سکتی!

بہر حال سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثہ فاجعہ پاکستان کے عدمِ استحکام کا منہ بولتا ثبوت ہے اور آئندہ کے لیے ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر مناسب ہے کہ اس کی یاد کبھی کبھی تازہ کر لی جائے اس

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!"

۲- سرزمینِ بے آئین

پاکستان کے عدمِ استحکام کا دوسرا جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ قمری تقویم کی رُو سے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ چکنے کے باوجود یہ ملک تاحال سرزمینِ بے آئین کی حیثیت رکھتا ہے اور ع "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق بے آئینی ہی اس کا آئین اور بے دستوری ہی اس کا دستور ہے -!

راقم الحروف اپنے زمانہ طالب علمی میں جبکہ وہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا ناظمِ اعلیٰ تھا عزم کے نام سے جمعیت کے سرکاری جریدے (ORGAN) کی ادارت کا ذمہ دار تھا- اس میں ایک صفحہ مستقل طور پر پاکستان کے زیرِ تدوین دستور کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین اور خطوط کےلیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اُس کا عنوان اِس شعر کو بنایا گیا تھا کہ ے

"اِس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں، اِس فکر میں غنچے سُوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہو گا، دستورِ بہاراں کیا ہو گا"

ذرا تصور کیجئے کہ یہ ۵۲-۵۳ء کی بات ہے گویا اس پر پُوری ثلث صدی بیت چکی ہے لیکن آج بھی صُورتِ حال جُوں کی توں ہے اور اس میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوا- اس لیے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد خان لیاقت علی خان مرحُوم کی بی پی سی رپورٹ (BASIC PRINCIPLES COMMITTEE REPORT) کے ردّ ہو جانے کے بعد دستور سازی میں جو کئی سال کا وقفہ اور خلاء رہا تھا وہ خدا خدا کر کے ۵۶ء میں ختم ہوا تھا لیکن ۵۶ء کے دستور کو واقعتہً دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوئی- پھر ۶۲ء کا دستور آیا اور صرف چند سال قائم رہ کر ختم ہو گیا- اس کے بعد ۷۳ء میں مسٹر بھٹو نے واقعتہً ایک عظیم کارنامہ سر انجام دیا تھا کہ دن رات محنت کر کے اس پارلیمنٹ کا اتفاق رائے (CONSENSUS) حاصل کر لیا تھا جس کی نمائندہ حیثیت غیر متنازعہ تھی، یہاں تک کہ آج تک بھی اُس کے بارے میں اِس پہلو سے کسی نے حرف زنی نہیں کی کہ جن انتخابات کے ذریعے وہ وجُود میں آئی تھی وہ قابلِ اعتماد

نہ تھے! لیکن افسوس کہ اوّلاً خود انہوں نے اس میں پے بہ پے ترامیم کر کے اُس کا حلیہ بگاڑ دیا اور اُس کی غیر متنازعہ حیثیت کو بھی مجروح کر دیا۔ اور اِس سلسلے میں وہ اپنی مجرّد عددی قوت (BRUTE MAJORITY) کو جس بھونڈے طور پر بروئے کار لائے اُس نے واقعہ یہ ہے کہ اُن کی اپنی حیثیت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اور پھر ۷۷ء کے مارشل لا۔ نے اُسے اوّلاً ساڑھے آٹھ سال تک معطل رکھا اور پھر ترامیم کے ذریعے اُس کے پورے نقشے ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ اور اگرچہ حال ہی میں اُس پر طویل بحث و مباحثہ اور گفت و شنید اور "کچھ لو اور کچھ دو" (GIVE AND TAKE) کے اصُول پر سمجھوتے کے بعد پارلیمنٹ سے مہر تصدیق ثبت کرالی ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ اِس پارلیمنٹ کی حیثیت ہرگز غیر متنازعہ نہیں ہے۔ اور مارشل لا۔ اُٹھنے کی دیر ہے کہ اس کے ضمن میں پورا النجۂ اختلاف و انتشار (PANDORA'S BOX) ایک دَم کھل جائے گا اور آزادانہ تصادم و کشمکش (FREE FOR ALL) کی وہ کیفیت دوبارہ پیدا ہو جائے گی جو ۷۰-۱۹۶۹ء میں پیدا ہو چکی ہے اور پھر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس صورتِ حال کا نتیجہ کیا برآمد ہو گا! اِس لیے کہ اتنی بات تو ریکارڈ پر موجود ہے اور سب ہی کو معلوم ہے کہ ملک کی متعدد سیاسی جماعتوں اور اہم سیاسی شخصیتوں نے بارہا کہا ہے کہ اگر ایک بار ۷۳ء کا دستور ختم ہو گیا تو پھر دوبارہ پاکستان کا دستور کبھی نہ بن سکے گا۔ واللہ اعلم!! ۔ واعاذنا اللہ من ذالک!!!

۳۔ کنفیڈریشن کا شوشہ

عدم استحکام کا ایک تیسرا مظہر اور مسلسل بے دستوری اور بے آئینی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اب ملک کے متعدد اور مسلّم سیاسی اہمیّت کے حامل رہنما برملا کنفیڈریشن کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایک باضابطہ "اتحاد" "سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ" کے نام سے وجُود میں آچکا ہے۔ اور یہ فرنٹ تو ملک سے باہر بنا ہے اور اس میں شریک زعماء اس وقت خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن عین باب الاسلام یعنی سندھ کے قلب میں بیٹھ کر ایک شخص اس سے بھی آگے بڑھ کر برملا کہہ رہا ہے کہ "اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان کو توڑ دیا جائے!" اور کنفیڈریشن کے نعرے پر طنزیہ تبصرہ کرتا ہے "ہمیں کنفیڈریشن ضرور مطلوب ہے، لیکن پاکستان کے اندر نہیں بلکہ اس سے باہر!!" اور اس سے بھی ایک قدم مزید آگے بڑھا کر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ: "ہم مارشل لا۔ کی تائید اسی لیے کرتے ہیں کہ اصل میں پاکستان اسی کے ذریعے ٹوٹے گا! اور ہم ایم آر ڈی کی تائید اس لیے نہیں کرتے کہ وہ جمہوریت کی علمبردار ہے اور جمہوریت پاکستان کے

بقا کا ذریعہ بن جائے گی !۔ واضح رہے کہ مجھے اس وقت اُن صاحب کے کسی قول کی صحت یا عدم صحت سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ یہ تذکرہ صرف ع "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا" کے قبیل سے ہے !

۴۔ بھارت کا استحکام

عربی مقولے "تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا" (چیزوں کی حقیقی معرفت اُن کی مخالف اور متضاد اشیاء کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے!) کے مطابق اپنی اس حالت کا موازنہ کیجیے بھارت کے ساتھ، جو پاکستان کا پیدائشی دشمن ہے۔ اِس لیے کہ اُس نے ذہناً اور قلباً پاکستان کو ایک دِن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ کون نہیں جانتا کہ ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے بھارت کی موجُودہ تقسیم عارضی ہے اور اُن کے دِلوں میں اِس اُمید کے چراغ روشن ہیں کہ وہ دِن زیادہ دُور نہیں جب بھارت پھر 'اکھنڈ' ہو جائے گا۔ اُن کے صحافی اور دانشور پاکستان اگر برملا کہتے ہیں کہ "ہم نے پاکستان کو تو ضرور تسلیم کیا ہے، لیکن نظریۂ پاکستان کو ہرگز تسلیم نہیں کیا!" یہ گویا نہایت لطیف اور ڈپلومیٹک انداز ہے یہ کہنے کا کہ ہم پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے۔

غور طلب امر ہے کہ بھارت بھی ہمارے ہی ساتھ —— بلکہ ہم سے ایک دن بعد آزاد ہوا تھا لیکن اُس نے جھٹ پٹ دستور بنایا اور اس کی گاڑی ایمرجنسی کے ایک مختصر سے وقفے کے سوا چالیس سال ہونے کو آئے کہ کبھی اُس دستور کی پٹڑی سے نہیں اُتری۔ حالانکہ وہ اگر ہم سے دس گنا بڑا ہے تو اُس کے مسائل ہم سے پچاس گنا زیادہ پیچیدہ اور گھمبیر ہیں۔ چنانچہ نسلی و لسانی اور تہذیبی و ثقافتی تقسیم تو وہاں پاکستان کے مقابلے میں کم از کم دس گنا زیادہ ہے ہی، اس پر مستزاد ہے وہ مذہبی تقسیم جس نے وہاں کے مسائل کو مزید کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں کم از کم اِس 'بچے کھچے پاکستان' (WHAT REMAINS OF PAKISTAN) میں یہ عامل نہ ہونے کے برابر ہے۔!! —— الغرض معاملہ وہی ہے کہ ؎

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ!

آئینی اور دستوری سطح پر بھارت کی اِس 'پختہ زنّاری' کے ساتھ ساتھ ایک نظر ڈالیے اُس کی صنعتی اور عسکری ترقی پر جس نے اُسے اِس علاقے کی چھوٹی سُپر پاور کا درجہ دے دیا ہے اور غور کیجیے اِس واقعی صورتِ حال پر کہ دونوں عالمی طاقتیں اُس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہیں۔ چنانچہ جناب آغا شاہی جو غالباً پاکستان کی تاریخ میں

طویل ترین عرصے تک پاکستان کے وزیر خارجہ رہے ہیں اپنی ایک تحریر میں صاف لکھ چکے ہیں کہ راجیو گاندھی کے دورۂ امریکہ کے موقع پر یہ طے پاگیا ہے کہ امریکہ بھارت کو جنوبی ایشیا کی منی سُپر پاور (MINI SUPER POWER) تسلیم کرتا ہے اور اُس کی اِس حیثیت کو کسی بھی اعتبار سے نہ چیلنج کرے گا نہ مجروح کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ وقت قریب ہے کہ امریکہ پاکستان کو مجبور کریگا کہ وہ بھارت کے ساتھ اُس کی شرائط پر صلح کرے! الغرض! بھارت کا یہ استحکام بھی پاکستان کے عدمِ استحکام کے ضمن میں ایک تقویتی عامل کی حیثیت رکھتا ہے!

عدمِ استحکام کا سبب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ع "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!" کے مصداق اِس عدمِ استحکام کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کا ایک سبب اصلی اور بنیادی ہے اور ثانوی درجے میں اِس اساسی سبب کے کچھ ثمرات و نتائج ہیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے!

اِس کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے عالمِ وجود میں آیا تھا لیکن افسوس کہ اس میں بسنے والوں نے اس کے وجود میں آنے کے فوراً بعد اُس نظرئیے ہی کو فراموش کر دیا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی درخت کی جڑ سُوکھ جائے اور اُسے پانی نہ دیا جائے! اس کے نتیجے میں وہ لازماً مرجھا جائے گا! اُس کے پتے جھڑ جائیں گے، شاخیں سُوکھ جائیں گی اور کچھ عرصے بعد اُس میں سے ایک سُوکھے تنے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا! چنانچہ بعینہٖ یہی صورتِ حال پاکستان کو درپیش ہے۔

اِس سے بھی آگے بڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا حصُول برِّصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کے قافلۂ ملّی کی اصلی اور آخری منزل نہیں بلکہ صرف پہلا 'پڑاؤ' تھا! اور اِس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اِس کے قافلہ سالار اپنے شرکاءِ سفر کو پوری شدت سے یاد دلاتے رہتے کہ ع "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!"۔ لیکن افسوس کہ اِس بدنصیب قافلے کے رہنماؤں کی اکثریت نے خود ہی پہلے پڑاؤ پر پہنچ کر اصل منزل کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ جب خود رہنما ہی اُس پڑاؤ کو اصل منزل قرار دے کر محوِ استراحت ہو گئے تو عوام کا تو کہنا ہی کیا ہے اُن کی اکثریت نے بھی اگر ع "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ

نیست ؟ کی عامیانہ شرح کو طرزِ زندگی بنا لیا تو اُن سے کیا گلہ، اور کیسا شکوہ !!

اس اصل اور اساسی سبب کے نتیجے میں جب ذہنی و فکری انتشار، اخلاقی و عملی اختلال اور سیاسی و انتظامی بحران پیدا ہوا تو اوّلاً کچھ ہوشیار اور چالاک سرکاری ملازمین (CIVIL SERVANTS) نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور جب اُسکے نتیجے میں ع "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کے مصداق انتشار و اختلال مزید بڑھ گیا تو آخر کار ملک کے منظم ترین ادارے یعنی فوج نے عوام کو سیاسی اعتبار سے نابالغ اور سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو بدقماش اور آوارہ قرار دے کر ملک و ملّت کی سرپرستی (GUARDIANSHIP) کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سے بھی صورتحال میں کوئی بہتری تو نہ پیدا ہو سکتی تھی نہ ہوئی !! ۔ لیکن اس کی کوکھ سے مزید پیچیدگیوں اور خرابیوں نے جنم لے لیا۔ جن میں سے سب سے بڑی اور خوفناک پیچیدگی یہ ہے کہ چونکہ پاکستان کی مسلح افواج کی ایک عظیم اکثریت ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا دوسرے علاقے کے لوگوں میں احساس کچھ از خود اُبھرا اور کچھ ملک و ملّت کے دشمنوں نے اُبھارا کہ ایک علاقے کے لوگ پورے پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں ! چنانچہ اوّلاً یہ احساس پوری شدّت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوا اور اُس کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا ! بعد ازاں یہی احساس ہے جس کی کوکھ سے اس بچے کھچے پاکستان میں سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ، نے جنم لیا ہے اور اگر خدانخواستہ ان ثانوی اثرات و نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جلد از جلد پاکستان میں ایک زوردار تحریک ایسی نہ اُبھری جو ع

"سُوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را !"

کے انداز میں اس بھولے اور بھٹکے ہوئے قافلے کو اپنی اصل منزل دوبارہ یاد دلا دے اور ع

"ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا !"

کی شان کے ساتھ ایک "ولولۂ تازہ" اور "عزمِ نو" کے ساتھ دوبارہ سرگرمِ سفر کر دے تو اندیشہ ہے کہ کہیں بدخواہوں کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت نہ ہو جائیں اور دشمنوں کے گھروں میں واقعتہً گھی کے چراغ نہ جلنے لگیں !

تو آیئے کہ غور کریں کہ :۔

پاکستان کی اصل جڑ اور بنیاد کیا ہے ، اور اس کے استحکام کی بنیاد کون سی چیز بن سکتی ہے ؟؟

پاکستان کی اصل اساس

عالمی سطح پر بھی عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے (بلکہ اس ضمن میں بالکل غلط طور پر اسرائیل کا نام بھی پاکستان کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے) اور اندرونِ ملک بھی یہ بات اتنے زور شور، اس قدر شدّومد اور اس درجہ تکرار و اعادہ کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اب عام طور پر تو اس جانب دھیان ہی نہیں دیا جاتا اور بہت سے لوگوں کو اس سے متلی کی سی کیفیت (NAUSEA) کا احساس ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ منبر و محراب سے تو یہ صدا تقریباً مسلسل ہی بلند ہوتی رہی ہے اور سیاست کے میدان کے بھی نیم سیاسی اور نیم مذہبی کھلاڑیوں نے اکثر و بیشتر اسی 'نعرے' کا سہارا لیا ہے۔ لیکن گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران خود ایوانِ حکومت سے یہ راگ جس تسلسل اور بلند آوازی کے ساتھ الاپا گیا ہے اُس نے غالباً سب کو مات دے دی ہے! —— (اگرچہ اکثر سیاسی مبصّرین کی رائے یہ ہے کہ اب یہ نعرہ اپنی معنویت اور تاثیر کھو چکا ہے)

دوسری جانب گاہے گاہے کچھ دوسری باتیں بھی سننے میں آتی رہتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا۔ اس کے وجود میں آنے کے اصل اسباب خالص سیاسی تھے یا خالص معاشی!

جہاں تک یادداشت ساتھ دیتی ہے اِس بات کو برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہنے والی پہلی سیاسی شخصیت جناب حسین شہید سہروردی کی تھی، جنہوں نے اِس رائے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان خالص معاشی اسباب کی بنا پر قائم ہوا ہے۔ تاہم اُن کی بات کو زیادہ اہمیّت اِس لیے نہیں دی گئی تھی کہ وہ بذاتِ خود ایک متنازعہ شخصیت تھے اور قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً بعد ہی انہوں نے مسلم لیگ سے کٹ کر اپنی

علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرلی تھی لیکن کچھ عرصے بعد جب جناب نورالامین نے بھی ماہنامہ 'اُردو ڈائجسٹ' میں شائع شدہ ایک طویل انٹرویو میں اسی رائے کا اظہار کیا تو اِس کا وزن محسوس کیا گیا اور سوچنے سمجھنے والوں نے کم از کم یہ ضرور محسوس کیا کہ بات غور و فکر کے قابل ہے۔

ان دونوں حضرات کی یہ "متفق گردید رائے بوعلی با رائے مَن" کے مصداق متفق علیہ بات اِس لیے بھی اہمیت اختیار کر گئی کہ ان دونوں کا تعلق متحدہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے سے تھا، مزید برآں اُسی کے صدر مقام ڈھاکہ کو مسلم لیگ کے 'مولد' (جائے ولادت) کی حیثیت حاصل تھی اور وہیں مسلم لیگ نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی نشو و نما پائی تھی بلکہ طویل عرصے تک حکومت بھی کی تھی۔ مزید برآں یہ صوبہ وہ تھا جو تقسیم ہند سے بہت قبل ایک بار صوبائی تقسیم کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ الغرض اُن دونوں حضرات کی بات ہرگز ایسی نہ تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی۔ چنانچہ پاکستان کی نئی نسل نے بلاشبہ اِن حضرات کی بات کا اثر قبول کیا۔

یہ دونوں بزرگ تو عرصہ ہوا اِس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ بدقسمتی سے گزشتہ دو تین برسوں کے دَوران دو اور بزرگ شخصیتوں کی جانب سے بھی اِس سے ملتی جلتی رائے سامنے آئی ہے۔ اگرچہ اِس بار جو لفظ استعمال ہوا وہ 'معاشی' نہیں 'سیاسی' ہے۔ چنانچہ پہلے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تحریکِ پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ خالص سیاسی تحریک تھی، اور جب اُن پر لے دے ہوئی تو انہوں نے جو وضاحتیں اور معذرتیں پیش کیں وہ بالکل "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق تھیں نتیجتہً جس قدر وہ وضاحتیں پیش کرتے گئے اتنے ہی دلدل میں مزید پھنستے چلے گئے۔ بعدازاں جناب سردار شوکت حیات خاں صاحب سامنے آئے اور انہوں نے یہ فرما کر کہ "پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ لاالٰہ اِلاّ اللہ" ہرگز کوئی سنجیدہ اور سوچی سمجھی بات نہیں تھی بلکہ یہ نعرہ تو چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا!" گویا بات ہی ختم کر دی!

کسی کو ان دونوں حضرات کی رائے خواہ کتنی ہی غلط نظر آئے، اِس حقیقت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں تحریکِ پاکستان کے کارکنوں اور قائدِ اعظم کے نوجوان ساتھیوں میں شامل تھے اور فی الوقت دونوں ہی کا شمار موجودہ بچے کھچے پاکستان کے بزرگ ترین سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ مزید برآں دونوں کا تعلق اُس صُوبے سے ہے جو موجودہ پاکستان میں ہر اعتبار سے عظیم ترین ہے!

اِس صورتِ حال کا خوفناک ترین نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ؎ "شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا!" کے مصداق پاکستان کی نئی نسل شدید ذہنی و فکری انتشار (CONFUSION) کا شکار ہے اور اُسے نہ اپنے تشخص کا شعور حاصل ہو سکا ہے نہ کسی مقصد یا منزل ہی کا سراغ مل سکا ہے، اور اس کی حالت کم و بیش اُس مسافر کی سی ہے جو گھر سے تو کسی معیّن کام کے لیے کسی شہر کے سفر کے لیے چل پڑا ہو لیکن اثنائے سفر میں کسی حادثے کے باعث اُس کی یادداشت زائل ہو جائے اور اب اُسے نہ یہ یاد رہے کہ میرا گھر کہاں ہے اور مَیں نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا؟ اور نہ یہ یاد رہے کہ مَیں جا کہاں رہا ہوں اور وہاں مجھے کام کیا کرنا ہے؟

لہٰذا اِس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پوری سنجیدگی اور زیادہ سے زیادہ حقیقت و واقعیّت پسندانہ (REALISTIC) اور ممکنہ حد تک معروضانہ (OBJECTIVE) انداز میں غور کیا جائے کہ قیامِ پاکستان کا اصل سبب کیا تھا؟ تحریکِ پاکستان کے اصل محرکات کیا تھے؟ ۔ اور وطنِ عزیز کی کوئی حقیقی اور واقعی جڑ بنیاد ہے بھی یا نہیں؟

اور اِس جائزے اور تجزیے کے دَوران ضرورت ہوگی کہ نہ حقائق کو مسخ کیا جائے، نہ کسی 'آرزومندانہ اندازِ فکر' (WISHFUL THINKING) کو دخل انداز ہونے کا موقع دیا جائے، نہ کسی شخصیّت کی عظمت اور محبّت و عقیدت کو حائل ہونے دیا جائے اور نہ کسی کی ناراضگی یا رضامندی کا لحاظ کیا جائے بلکہ اصل حقائق کو جرأت و ہمّت کے ساتھ خود بھی قبول کیا جائے اور پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ اُن کا ڈنکے کی چوٹ اظہار و اعلان بھی کیا جائے!

اِس نہایت پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلے کے حل کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ پہلے اِس کی تین جداگانہ سطحوں (LEVELS) کا شعور حاصل کر لیا جائے اور پھر ہر سطح پر حقیقت کے جزوی ادراک کے بعد حقیقتِ کُلّی کی جانب پیشقدمی کی جائے!

اِس مسئلے کی تین جداگانہ سطحوں کے لیے بہترین تمثیل زمین پر پانی کی تین مختلف سطحوں کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ ایک پانی وہ ہے جو سطحِ زمین پر دریاؤں اور ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ظاہر و باہر پانی جو ہر انسان کو بچشمِ سر نظر آتا ہے یہی ہے؛ پانی کی دوسری سطح وہ

ہے جہاں سے اُسے کنوؤں اور ہینڈ پمپوں وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہے اور اس کے سوتے کہیں تیس چالیس فٹ گہرائی پر چل رہے ہوتے ہیں کہیں ستر اسی فٹ کی گہرائی پر اور کہیں اس سے بھی نیچے، اور ازمنۂ قدیم سے ماضی قریب تک دریاؤں اور ندیوں سے بُعد اور فاصلے پر انہی زیر زمین سوتوں کا پانی بقائے حیات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ جبکہ پانی کی تیسری سطح وہ ہے جو سطح زمین سے کئی سو فٹ نیچے ہے اور جہاں سے زمانۂ حال میں پینے کے لیے صاف وشفاف پانی ٹیوب ویلوں کے ذریعے نکالا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پاکستان کی 'ایجاد' یا 'تکوین' (GENESIS) کے اسباب یا محرکات کو بھی بالکل تین علیحدہ سطحوں (LEVELS) پر سمجھا جاسکتا ہے:

اِس کی پہلی اور نمایاں ترین سطح یہ ہے کہ "پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا!" چنانچہ یہ ظاہرٌ باہر، حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، بجز اس کے کہ کوئی سخت ڈھٹائی ہی پر اُتر آئے۔ اور حقیقتِ واقعی کے انکار پر کمر کس لے۔ اس کی حیثیت اُس نوشتۂ دیوار (WRITING ON THE WALL) کی ہے جو ہر شخص کے سامنے رہتی ہو اور جس سے صرفِ نظر ممکن نہ ہو! یہی وجہ ہے کہ یہ بات پوری دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی کو پسند ہو یا ناپسند!

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کو از درۂ خیبر تا راس کماری اور از مکران تا چاٹگانگ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے والا نعرہ بہر صورت "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" ہی تھا اور اس سے ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اِس کے الفاظ بزرگوں نے متعین کیے تھے یا نوجوانوں نے ترتیب دے لیے تھے۔

پھر بات صرف ایک نعرے کی نہیں ہے بلکہ اُن واضح وغیر مبہم اور واشگاف و برملا بیانات و اعلانات کی ہے جن کے ذریعے پاکستان کے بانی و موسّس اور تحریکِ پاکستان کے 'قائدِ اعظم' نے مسلمانوں کی قومیّت کی اساس 'مذہب' کو پاکستان کی منزل 'اسلام' کو اور پاکستان کا دستور 'قرآن' کو قرار دیا تھا اور قیام پاکستان کا مقصد یہ بیان کیا تھا کہ ہم پاکستان کے ذریعے عہد حاضر میں اسلام کے اصُول حریّت، مساوات اور اخوت کی جدید تفسیر اور عملی نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں!۔ اس حقیقت سے انکار کوئی نہایت ڈھیٹ شخص ہی کرسکتا ہے کہ ان اعلانات کے بغیر نہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن سکتی تھی نہ برِصغیر پاک وہند کے طول وعرض میں بسنے والے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتے تھے۔ یہ حقیقت اتنی

ظاہر و باہر اور سطحِ زمین پر بہنے والے دریاؤں اور ندیوں کے پانی کے مانند اتنی عیاں ہے کہ اس پر قلم و قرطاس کا مزید صرف تحصیلِ حاصل کے ذیل میں آئے گا۔

تو اب آیئے دوسری سطح کی جانب جس کا صحیح تعین ایک سوال کی صورت میں کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ "تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ کیا تھا؟" ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ یہ سوال نہایت گہرا ہے اور اس کا جواب دینا آسان کام نہیں ہے! مزید برآں یہ کہ اس سوال کے جواب میں پوری دیانت اور خلوص و اخلاص کے باوجود اختلاف کی بڑی گنجائش موجود ہے۔!

ان سطور کے عاجز و حقیر راقم کے نزدیک اس سوال کا ایک منفی جواب تو بادنیٰ تامل سامنے آسکتا ہے اور اس پر اتفاق (CONSENSUS) بھی زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ تحریکِ پاکستان کے اصل محرک کی مثبت تعیین واقعۃً آسان نہیں!

شاید بہت سے قارئین اس پر چونک جائیں اور حیران ہوں کہ راقم بھی اُن لوگوں کی رائے کو درست سمجھتا ہے جن کے نزدیک تحریکِ پاکستان کا اصل عامل اور جذبۂ محرکہ 'مذہبی' نہیں کچھ اور تھا۔ اس 'کچھ اور' پر تو گفتگو بعد میں ہوگی سرِدست راقم اپنے آپ کو اس دیانت دارانہ رائے کے اظہار پر مجبور پاتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا اور اُس کے نزدیک اس کا بالکل بیّن اور ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی اصل قیادتِ علیا ہرگز "مذہبی لوگوں" پر مشتمل نہیں تھی اور اس قاعدۂ کلیہ سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی تحریک کا اصل جذبۂ محرکہ سب سے زیادہ نمایاں اور 'دکھائی دینے والی' صورت میں اُس کی قیادت میں نظر آنا لازم ہے۔!

یہ حقیقت اگرچہ کسی قدر تلخ ہے اور اس کا اظہار غالباً بہت سے لوگوں کو ناگوار بھی محسوس ہوگا لیکن ہمیں اپنی قومی زندگی کے چالیسویں برس میں تو اتنا 'بالغ' ہو جانا چاہیے کہ تلخ حقائق کا اعتراف ہی نہیں اعلان بھی کر سکیں۔

اس مرحلہ پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ شرافت و مروّت اور صداقت و دیانت جداگانہ حقیقتیں ہیں اور 'مذہبیت' ایک جداگانہ حقیقت ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال، ابوطالب سے قطع نظر کر اُن کا معاملہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مابین مختلف فیہ ہے، مطعم بن عدی کی ہے جس نے سفرِ طائف سے واپسی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر اپنی امان کے اعلان اور اپنے چھ بیٹوں

سمیت ہتھیار بند ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بحفاظت مکّہ میں داخلے کا اہتمام کیا تھا! اگرچہ وہ خود آخری وقت تک ایمان نہیں لایا اور اُس کی موت کفر و شرک ہی پر واقع ہوئی۔

اِسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اِس وقت ہم ایک عوامی تحریک کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں زیرِ بحث 'مذہبیت' کا بھی وہ معیار او تصور قابلِ لحاظ ہو گا جو عام مسلمانوں میں معروف و مشہور ہو نہ کہ کسی خاص دانشور کا اپنے ذہن و فکر سے تراشیدہ اور خود اختیار کردہ معیار و تصوّر۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالباً کوئی ایک شخص بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ تحریک پاکستان کی اصل قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ نہ صرف یہ کہ اس وقت عوامی سطح پر مروّجہ تصوّرات کے مطابق 'مذہبی' لوگ نہ تھے بلکہ اُن کی اکثریت جدید دَور کی مروّجہ اصطلاح کے مطابق "PRACTISING MUSLIMS" پر بھی مشتمل نہ تھی!

اِس ضمن میں ایک فیصلہ کن مثال تو اُس واقعے کی صورت میں سامنے آتی ہے جو راقم کو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے سنایا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں جالندھر میں مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کا جو اجلاس سکھوں کے ساتھ گفت و شنید کے اصوٗل طے کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں مسلم لیگ کے ۲۳ اعلیٰ ترین قائدین شریک تھے (چشتی صاحب نے بہت سے حضرات کے نام بھی تعیّن کے ساتھ لیے تھے جو میری نوٹ بک میں درج ہیں لیکن اس وقت اُن کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا!) اُس میں جب مغرب کی نماز کا وقت آیا تو نماز کے لیے جو لوگ اُٹھے وہ کُل دو ۲ تھے: ایک بیگم مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور جو برقع پوشی کی حالت میں شریک اجلاس تھیں اور دوسرے خود پروفیسر یوسف سلیم چشتی جو اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ نواب سَر شاہنواز ممدوٹ کی علالت کے باعث اُن کے نمائندے کی حیثیت سے شریکِ اجلاس تھے! مَیں چشتی صاحب کی اس روایت کو قبول کرنے میں شاید کچھ تامّل کرتا لیکن جب مجھے یاد آیا کہ بالکل یہی کیفیت ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کے دن لاہور میں منعقد ہونے والی 'عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس' کے موقع پر پیش آئی کہ مغرب کی نماز کے وقت بھی اجلاس ایسے جاری رہا تھا جیسے کسی کو احساس ہی نہ ہو کہ کون سا وقت آیا اور گذر گیا۔ (اُس وقت غالباً واحد مستثنیٰ ذات شاہ فیصل شہید کی تھی جو مغرب کی نماز ادا کر کے تاخیر ہی سے اجلاس میں شریک ہوئے تھے) تو اِس واقعے کی صحت تسلیم کرنے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔

دوسری نہایت پیاری بات وہ ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ سے منسوب کی جاتی ہے کہ جب اُن پر کسی نے اعتراض کیا کہ آپ اتنی عظیم دینی و روحانی شخصیت کے حامل بلکہ لاکھوں کے دینی و روحانی مقتدا اور رہنما ہو کر ایک داڑھی منڈے شخص (مراد تھے قائد اعظم مرحوم!) کے پیچھے کیسے لگ گئے اور آپ نے کیسے اُسے اپنا رہنما تسلیم کر لیا؟" تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "بھائی! مَیں نے محمد علی جناح کو اپنا دینی یا روحانی پیشوا نہیں مانا بلکہ صرف اپنے قومی مقدمے کے لیے ایک قابل و ماہر اور شریف و دیانتدار وکیل کے طور پر قبول کیا ہے!" اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قائد اعظم یقیناً ایک نہایت قابل و ماہر وکیل بھی تھے اور اُن کی دیانت اور امانت پر بھی کوئی حرف اُنکا بدترین دشمن بھی نہیں رکھ سکا۔ اس کے باوجود نہ وہ واقعتہً 'مذہبی' انسان تھے نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو تکلفاً یا تصنعاً اس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

رہے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تو خواہ وہ اپنے اپنے مقام پر کسی بھی مرتبے اور حیثیت کے مالک رہے ہوں واقعہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی قیادت کے ضمن میں اُن کا مقام اولین صف میں نہیں بلکہ ثانوی درجے میں تھا۔ اور اُن کی اصل حیثیت 'قائدین' کی نہیں بلکہ 'معاونین' کی تھی!!!

بہر حال زیر بحث سوال کے اس منفی جواب کے بعد آیئے کہ اِس کا مثبت جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں:

ہمارے نزدیک اِس ضمن میں پُوری حقیقت کی جامع تعبیر نہ 'معاشی' کے لفظ سے ہو سکتی ہے نہ 'سیاسی' سے، بلکہ اس کی صحیح اور جامع تعبیر کے لیے موزوں ترین لفظ وہی ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ کے محولہ بالا قول میں استعمال ہوا ہے یعنی 'قومی'!

تحریک پاکستان اصلاً ایک قومی تحریک تھی اور اُس کا اصل جذبۂ محرکہ ایک چھوٹی قوم کا 'خوف' اور 'خدشہ' تھا کہ اُس سے کئی گنا زیادہ بڑی قوم اُس کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ نہیں کرے گی بلکہ سیاسی اعتبار سے اُسے 'محکوم' بنانے کی کوشش کرے گی، معاشی سطح پر اُس کا استحصال کرے گی اور سماجی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے اُس کے تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور اِسی پر بس نہیں کرے گی بلکہ ہر ممکن ذریعے سے اپنی گذشتہ محکومی کا بدلہ لینے اور حساب چکانے کی کوشش

کرے گی یعنی اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے گی!۔ اور چونکہ یہ 'خوف' اور 'اندیشہ' نہ فرضی تھا نہ خیالی، وہی بلکہ حقیقی اور واقعی تھا جس کا ادراک و احساس مسلمانانِ ہند کے ہر طبقے اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہو رہا تھا لہٰذا اِس تحریک نے جنگل کی آگ کی طرح وسعت اختیار کر لی اور اپنے جداگانہ تشخص کی ضمانت اور اپنے سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت کے لیے برصغیر کی پوری مسلمان قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی!۔ اور اس نعرے سے برصغیر کا طول و عرض گونج اُٹھا کہ 'مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'!

گویا تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ نہ مذہبی تھا۔ نہ محدود معنی میں معاشی یا سیاسی بلکہ وہ ایک قومی جذبہ جس نے جملہ تہذیبی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی محرکات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا!

مسئلہ زیرِ بحث کی تیسری اور سب سے گہری سطح کا تعین اِس سوال کی صورت میں ہوتا ہے کہ "اُس چھوٹی قوم کی قومیت کی بنیاد کیا تھی؟" جس کے جواب میں ہم لامحالہ وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے، اس لیے کہ یہاں پھر ایک ناقابلِ تردید حقیقت کا سامنا ہے اور وہ یہ کہ برصغیر کے مسلمان نہ کسی نسل کی بنیاد پر ایک قوم تھے، نہ زبان کی بنیاد پر، پھر نہ اُن کا لباس ایک تھا نہ اکل و شرب کے ذوق اور طور طریقے ایک تھے، بلکہ اُن کو ایک قوم بنانے والی کوئی قدرِ مشترک تھی تو صرف ایک یعنی مذہب! یہی وجہ ہے کہ اگرچہ تحریکِ مسلم لیگ اصلاً ایک مذہبی تحریک نہ تھی، نہ ہی اِس کی اصل قیادت مذہبی لوگوں پر مشتمل تھی لیکن اُسے مسلمانانِ ہند میں ایک قومی وحدت کے شعور کو بیدار اور اُجاگر کرنے کے لیے سب سے زیادہ انحصار مذہبی جذبے پر کرنا پڑا اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" کے مصداق مذہبی نعرہ لگانا پڑا یعنی "پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ"!

ہمیں اس بحث میں جانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اِس نعرے میں وہ قیادت مخلص تھی یا غیر مخلص، اس لیے بھی کہ نیتوں کا حال صرف اللہ کے علم میں ہے اور ہمیں لوگوں کی نیتوں کو زیرِ بحث لائے بغیر ساری گفتگو حقائق و واقعات ہی کے حوالے سے کرنی چاہیئے، اور اس لیے بھی کہ کسی عوامی تحریک کے ضمن میں اصل فیصلہ کسی خاص یا چند اشخاص کے خیالات و نظریات کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس اساس پر ہوتا ہے کہ اُس میں عوام نے شمولیت کس بنا پر اور کس تصور کے تحت کی!

بنابریں۔ اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور کسی شبہ کی گنجائش نہیں

ہے کہ پاکستان کی اصل اُساس سوائے دین و مذہب کے اور کوئی نہیں ہے'۔
اور پاکستان کی واحد جڑ بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے! اور جس طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ جب اُن سے نام دریافت کیا جاتا تھا تو اولاً صرف ایک لفظی جواب دیتے "سلمان"! اور اگر عرب کی روایت کے مطابق مزید پوچھا جاتا تھا کہ "سلمان ابن"۔ ۔ ۔ ۔ تو جواباً ارشاد فرمایا کرتے تھے؛ سلمان ابن اسلام!" یعنی میری ولدیت اسلام ہے اِسی طرح پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی 'ولدیت' اسلام ہے!!

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بُنیاد

تحریکِ پاکستان کے محرکات و عوامل، قیامِ پاکستان کے اسباب و وجوہات اور پاکستان کی اصل جڑ بنیاد کا مسئلہ فی نفسہٖ نہایت اہم ہے اور پاکستان کے کُل زوال و اضمحلال اور انتشارِ فکر و عمل کا اصل سبب یہی ہے کہ قومی سطح پر یہ بنیادی مسئلہ ہی متنازعہ اور مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ تاہم چلیے، تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اصل اہمیت اس کی نہیں اس لیے کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی تاریخ کے دھندلکوں میں غائب ہو چکا ہے اور ہمیں ماضی کے معاملے کو مستقبل کے مؤرخ کے حوالے کر کے اپنی ساری توجہات کو حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر پر مرکوز کر دینا چاہیے!

اِس صورت میں بھی ہمارے غور و فکر کا اصل مرکز و محور یہ سوال ہو گا کہ پاکستان کے استحکام کیلئے حقیقتہً اور واقعتہً ٹھوس بنیاد کون سی ہے جسے مضبوط کرنے سے پاکستان مستحکم ہو جائے اور اپنے وجود اور سالمیت کے خلاف جملہ داخلی اور خارجی حملوں کے مقابلے میں اپنا مؤثر دفاع کر سکے! یہ سوال، ظاہر ہے کہ، صرف دینی اور مذہبی نقطۂ نگاہ ہی سے اہم نہیں ہے بلکہ خالص مادی اور دُنیوی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے۔ اس لیے کہ یہ ہمارا وطن ہے اور نہ صرف یہ کہ اس وقت ہم اس میں آباد ہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی اسی سے وابستہ ہے۔ یہ باعزت ہے تو ہم بھی باعزت ہیں اور خدانخواستہ یہ ذلیل ہو جائے تو اصل ذلت ہماری ہو گی۔ یہ آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں، یہ غلام ہو گیا تو اصل غلام ہم ہوں گے۔ یہ خوشحال ہو گا تو ہم خوشحال ہوں گے اور اس پر تنگی آئی تو اس تنگی کا شکار ہم ہوں گے۔ گویا یہ کشتی تیرتی ہے تو ہم تیرتے ہیں اور یہ ڈوب گئی تو ہم غرق ہو جائیں گے! اِلّا ہر پاکستانی کے لیے لازم ہے کہ وہ

پاکستان کے باعزت بقاء اور اس کے استحکام کے مسئلے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کرے!
تو آیئے کہ سب سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ بالعموم ملکوں کو کن کن جہتوں سے تقویت ملتی ہے اور کن کن عوامل کی بنا پر استحکام حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے کون کون سے عوامل ہمیں پاکستان کے استحکام کے لیے دستیاب ہیں جنہیں مزید تقویت دے کر ہم پاکستان کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

۱۔ تاریخی عامل

ان میں سے اوّلین عامل کو 'تاریخی عامل' (HISTORICAL FACTOR) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ اگر کوئی ملک عرصۂ دراز سے ایک ہی نام اور ایک ہی حدود اربعہ کے ساتھ قائم ہو تو اس نام اور ان حدود کو ایک گونہ 'تاریخی تقدس' (HISTORICAL SANCTITY) حاصل ہو جاتا ہے اور یہ اس کی تقویت کا موجب اور اس کے استحکام کا سبب بن جاتا ہے، اور اگر کبھی اس پر بحیثیت مجموعی یا اس کے کسی علاقے پر جزوی طور پر کوئی دوسرا ملک قبضہ کر لیتا ہے تب بھی نہ اس کا نام بدلتا ہے نہ دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ علاقہ اب اس ملک کا حصہ نہیں رہا بلکہ قابض ملک کا جزو بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر جب سے دنیا کی تاریخ انسان کے علم میں ہے اسی وقت سے چین نامی ملک بھی دنیا میں موجود ہے اور اس کا نام بھی ہمیشہ سے یہی چلا آرہا ہے اور اس کی حدود بھی ہمیشہ تقریباً یہی رہی ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ جاپان نے چین کے بہت بڑے رقبے پر طویل عرصے تک قبضہ کیے رکھا لیکن یہ نہیں ہوا کہ وہ علاقہ 'چین' نہ رہا ہو بلکہ 'جاپان' بن گیا ہو۔ بلکہ چین چین ہی رہا اور جاپان جاپان رہا اور کہنے میں یہی آتا رہا کہ چین کے اتنے رقبے پر جاپان قابض ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تاریخی عامل اور یہ تاریخی تقدس پاکستان کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس نام اور ان حدود کے ساتھ تاریخ انسانی میں کبھی کوئی ملک موجود نہیں رہا۔ بلکہ پاکستان کا تو لفظ آج سے پچاس سال قبل تک دنیا کی کسی لغت میں موجود ہی نہیں تھا۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ اسی کا مظہر تھا کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے پاکستان کے نام کی قیمت 'ٹکا بھر' بھی نہ سمجھی اور مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوتے ہی اس نام کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اتار کر خلیج بنگال میں غرق کر دیا۔ ورنہ غور کا مقام ہے کہ کیا اس وقت دنیا میں دو[۱] جرمنی، دو[۲] یمن اور دو[۳] کوریا موجود نہیں ہیں؟ اور کیا ان میں سے کوئی ایک بھی

اپنے نام کو چھوڑنا گوارا کرے گا، ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں! یہ اس لیے کہ ان ناموں کی تاریخی حیثیت ہے جس کی بنا پر انہیں ایک شہرت اور نیک نامی (GOOD WILL) حاصل ہے جسے کوئی بھی ہاتھ سے دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ جبکہ 'پاکستان' ایک جدید اور 'حادث' نام ہے جس کی کوئی خاص قدر و قیمت ابھی قائم نہیں ہوئی!

واقعہ یہ ہے کہ راقم کے نزدیک اگر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جاتا لیکن اپنے نام کو برقرار رکھتا تو صدمہ تو اس صورت میں بھی ہوتا لیکن اکہرا۔ اور جب اس نے اپنا نام تک بدل ڈالا تو یہ دوہرے صدمے والی بات ہوئی۔ اس لیے کہ اس طرح ہمارے بنگالی بھائیوں نے نہ صرف خود اپنی پینسٹھ سالہ تاریخ سے اعلانِ برأت کیا بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ کی توہین کی جس کی مشترکہ متحدہ جدوجہد سے پاکستان قائم ہوا تھا! یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اس پورے معاملے میں اصل موردِ الزام ہمارے بنگالی بھائی ہیں یا ہم یا پوری سابقہ ملتِ اسلامیہ پاکستان ـــــــ اسی طرح ؎

"اور بھی دَورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے"

کے مصداق یہ بھی لازمی نہیں کہ مشرقی پاکستان کی یہ قلبِ ماہیت مستقل اور دائمی ہو۔ اِس ضمن میں بنگلہ دیش کے قیام سے لے کر اب تک بھارت کا جو سلوک اُس کے ساتھ رہا ہے اُس کے ردِ عمل کے طور پر الحمدللہ وہاں 'پاکستانیت' کا احیاء اِس حد تک ہو چکا ہے کہ مولوی فرید احمد مرحوم کے صاحبزادے کا یہ بیان سامنے آچکا ہے کہ ہم وہاں آئندہ الیکشن 'مشرقی پاکستان' کے نام پر لڑیں گے۔

بہرحال یہ رنج اور صدمے والی بات بھی اپنی جگہ اور اسی طرح آئندہ کے امکانات سے بھی قطع نظر، اِس وقت کی بحث کے اعتبار سے اصل اہمیت اِس حقیقت کی ہے کہ پاکستان کی تقویت کیلئے 'تاریخی تقدّس' کی قسم کا کوئی عامل موجود نہیں ہے! اِس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا وہ قول بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی جو حال ہی میں پاکستان کے بزرگ صحافی میاں محمد شفیع نے ایک روزنامے کے کالموں میں نقل کیا ہے یعنی یہ کہ "پاکستان کے معاملے کو ہندوستان پر قیاس نہ کیا جائے، ہندوستان ایک 'ملک' ہے اس کے حالات کتنے بھی خراب ہو جائیں بہرحال یہ موجود رہے گا جبکہ پاکستان ایک 'تجربہ' ہے جو اگر ناکام ہو گیا تو پاکستان کا نام و نشان مٹ جائے گا!" میرے نزدیک اگر یہ روایت درست

ہے تو مولانا مرحوم نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جس فرق کی نشاندہی کی ہے وہ اِسی تاریخی عامل پر مبنی ہے!!

۲۔ جغرافیائی عامل

کسی ملک کو تقویت دینے والا دوسرا عامل جغرافیائی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی سرحدیں فطری جغرافیائی حدود (NATURAL GEOGRAPHICAL BOUNDARIES) کی صورت میں ہوں تو اِس سے بھی اُس ملک کو ایک گونہ حفاظت حاصل ہوتی ہے جو اُس کی تقویت کی موجب اور اُس کے دفاع میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ کلامِ اقبال کے پہلے اُردو مجموعے کی پہلی نظم کے پہلے شعر میں یہ حقیقت بڑی خوبصورتی کے ساتھ سامنے آتی ہے یعنی ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چُومتا ہے تیری پیشانی کو جُھک کر آسماں

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ موجُودہ ساری سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی کے باوجود کوہِ ہمالیہ کی حیثیت بھارت کے شمال میں ایک فصیل کی سی ہے اور اگرچہ تقسیم ہند کے بعد ہمالیہ کے انتہائی مشرقی حصّے میں چین اور بھارت کے مابین ایک خونریز جھڑپ ہو چکی ہے جو نتائج کے اعتبار سے بھارت کے لیے نہایت ذلّت آمیز اور رُسوا کن ثابت ہوئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کی پوری تاریخ ایسے کسی واقعے سے بالکل خالی ہے اور اب بھی بھارت کو اِس جانب سے اندیشہ بہت کم ہے۔

اِسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ کے ضمن میں ہمیں خود یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ کس طرح ایک وقتی سے جوش اور جذبے کے تحت وجُود میں آنے والی بی آر بی کینال بھارت کے بھرپُور حملے کے مقابلے میں لاہور کی حفاظت کا ذریعہ بن گئی تھی۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو ۱۹۴۷ء میں قائم ہونے والا اصل پاکستان، تو واقعتہً تاریخ کا ایک انوکھا تجربہ نظر آتا ہے، اِس لیے کہ وہ ایسے دو خطوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھے اور اُن کے درمیان سمندر نہیں تھا بلکہ وہ ملک تھا جس کی مستقل حیثیت دُشمن کے علاقے، (HOSTILE TERRITORY) کی تھی اور غریب مشرقی پاکستان تو تین اطراف سے اُس

دشمن کے علاقے میں اِس طرح گھِرا ہُوا تھا کہ کسی جانب بھی کسی فطری وطبعی آڑ (NATURAL BARRIER) کا وجُود نہ تھا۔

مشرقی پاکستان کے مسئلے کو علیحدہ رکھتے ہوئے، موجودہ پاکستان کا حال بھی یہ ہے کہ اِسے کسی طبعی اور فطری سرحدوں کا تحفظ کسی درجے میں حاصل ہے بھی تو وہ شمال، جنوب اور مغرب میں ہے۔ یعنی شمال میں وہی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ قراقرم، جنوب میں سمندر اور مغرب میں کوہِ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ، جہاں تک اس کی طویل ترین مشرقی سرحد کا تعلق ہے، جدھر سے اسے سب سے زیادہ تحفظ کی ضرورت ہے اُدھر کسی فطری وطبعی سرحد کا نشان تک موجُود نہیں، چنانچہ پنجاب کا میدان اِس طرح کاٹا گیا ہے جیسے کیک کاٹا جاتا ہے "اور اگر خاردار تاروں کی کوئی باڑ موجُود نہ ہو تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کہاں ایک ملک ختم ہو گیا اور دوسرا شروع ہو گیا! رہا سابق ریاست بہاولپور اور پھر سندھ کے ریگزار اور صحرا کا تعلق تو اُس کے ٹیلے تو خود ہی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں، وہ کیا نشان بنیں گے اور کیا حفاظت کریں گے، ع "او خویشتن گم است کرا رہبری کند!"

الغرض، جغرافیہ بھی ہمارا پشت پناہ نہیں ہے بلکہ ہمارے خلاف ہے!

۳۔ انسانی جذبہ

ملکوں کو مستحکم کرنے والے تیسرے عامل کو 'انسانی جذبہ' کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی ملک یا خطّۂ ارضی کے رہنے والے انسانوں میں کوئی حقیقی اور واقعی جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ تاریخ کو بھی شکست دے سکتا ہے اور جغرافیہ سے بھی لڑ سکتا ہے، اس لیے کہ انسان واقعۃً اشرف المخلوقات ہے اور قدرت نے اِس میں بے پناہ قوتیں اور توانائیاں ودیعت کر رکھی ہیں! اور واقعہ یہ ہے جب کسی قوم اور بالخصوص اُس کے جوانوں میں کوئی جذبہ حقیقۃً اور واقعۃً پیدا ہو جائے تو اُس کا رُخ سوائے مشیّتِ ایزدی اور قدرتِ خداوندی کے دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں پھیر سکتی۔ بقول اقبال ؎

"عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں!"

اب اگر ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو انسانی جذبے کی دو ہی قسمیں نظر آئیں گی، ایک: قوم پرستانہ جذبہ اور دوسرا مذہبی جذبہ۔ ان میں سے بھی اگرچہ تاریخِ انسانی کے عظیم ترین معجزے تو مذہبی جذبے ہی کے تحت رونما ہوئے ہیں تاہم کچھ اس بنا پر کہ موجودہ دنیا میں یہ جذبہ بالعموم کمزور ہی نہیں معدوم کے درجے میں آگیا ہے۔ اور کچھ موجودہ بحث کی منطقی ترتیب کے تقاضے کے طور پر پہلے ہم 'قوم پرستانہ جذبہ' کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا اس کی کوئی قسم یا نوع ہمارے پاس بالفعل موجود یا ہمارے لیے ممکن الحصول ہے یا نہیں ؟

قوم پرستی کی اقسام

۱۔ نسلی قوم پرستی

قوم پرستی (NATIONALISM) کی اقسام کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے یہ حیران کن حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام تر علمی و سائنسی ترقی اور ذہنی و فکری ترفّع کے باوجود نسل پرستانہ قومیت (RACIAL NATIONALISM) کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر ہے۔ عہدِ حاضر میں اس کی دو نمایاں ترین مثالیں جرمن نیشنلزم اور یہودی نسل پرستی کی صورت میں موجود ہیں۔ جرمن قوم میں اپنے بارے میں ایک اعلیٰ اور برتر نسل (A SUPERIOR RACE) ہونے کے احساس نے اتنا جذبۂ عمل اور قوتِ مقاومت پیدا کر دی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بیسویں صدی عیسوی کے دوران جرمنی دو بار شدید ترین تباہی سے دوچار ہوا لیکن دونوں مرتبہ چند ہی سال کے اندر اندر پھر نہ صرف یہ کہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا بلکہ دوسری ہمعصر اقوام اور آس پاس کے ممالک کا ہر اعتبار سے ہمسر ہو گیا بلکہ بعض اعتبارات سے ان سے بھی بازی لے گیا۔ اسی طرح یہودی قوم میں بنی اسرائیل کے 'خدا کی منتخب اور پسندیدہ قوم' ("CHOSEN PEOPLE OF THE LORD") ہونے کے احساس نے مقاومت اور مدافعت کی اتنی صلاحیت اور اپنی برتری کے بالفعل اظہار (ASSERTION) کے لیے بے پناہ محنت اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ تاریخِ انسانی کے دوران بارہا انہیں شدید ترین جبر و تشدد (PERSECUTION) کا سامنا کرنا پڑا، اور بعض مواقع پر تو ان کے 'استیصال' (ANNIHILATION) اور کلّی اور مجموعی خاتمے

(MASS EXTERMINATION) ———— کی ایسی سر توڑ کوششیں ہوئیں کہ جن کی کوئی دوسری مثال تاریخِ انسانی میں مشکل ہی مل سکے گی، اس سب کے باوجود وہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور ع "اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے" کے مصداق اگر کسی ایک خطے یا ملک سے اُنہیں دلیس نکالا مل جاتا ہے تو کچھ ہی عرصے کے بعد نظر آتا ہے کہ انہوں نے کسی اور ملک میں قدم جما لیے ہیں۔ چنانچہ اِس صدی کے آغاز میں علامہ اقبال نے اُن کی جس کیفیت کا مشاہدہ بچشمِ سر یورپ میں کیا تھا جس کی تعبیر انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ ع "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!" اُس کے بعد بالخصوص جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں ان کا جو حشر ہوا اور وقتی طور پر اُنہیں جو نقصان پہنچا اُس کے چند سالوں کے اندر اندر انہوں نے بعینہٖ وہی حیثیت امریکہ میں حاصل کر لی۔ چنانچہ آج اسرائیل کی چھوٹی سی مملکت امریکہ ہی کی امداد اور سرپرستی کے بل پر نہ صرف پورے عالمِ عرب بلکہ پورے عالمِ اسلام کو ناک چنے چبوا رہی ہے۔ اور اسی پر بس نہیں دُور بیٹھے پاکستان تک کو دھمکیاں دے رہی ہے

اِس سلسلے میں ضمنی طور پر یہ بات بھی سامنے آجاتے تو اچھا ہے کہ یہ بات جو دنیا میں بالعموم کہی جاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے دو ملک مذہب کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل، تو یہ درحقیقت اسرائیل کی نسل پرستی کو چھپانے کا نہایت شاطرانہ انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص مذہب کی بنیاد پر دنیا میں صرف ایک ہی ملک قائم ہوا ہے اور وہ ہے پاکستان، اسرائیل کی اساس مذہب پر نہیں نسل پرستی پر ہے اور صیہونیت (ZIONISM) ———— اصلاً ایک دینی اور مذہبی تحریک نہیں بلکہ نسل پرستانہ تحریک (RACIAL MOVEMENT) ہے اور اسرائیل خالص نسل پرستانہ (RACIST) ملک ہے۔

بہرحال ہماری اس وقت کی گفتگو کے اعتبار سے اہم نکتہ یہ ہے کہ نظری طور پر نسل پرستی کی بنیاد پر بھی ایک نہایت طاقتور جذبہ وجود میں آسکتا ہے۔ لیکن (الحمدللہ کہ) پاکستان میں نسلی قومیت کیلئے کوئی اساس موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ برِصغیر پاک و ہند نسلی اعتبار سے غالباً پوری دنیا میں سب سے بڑی کھچڑی (بلکہ حلیم!) کی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اُسی کا ایک خلاصہ اس وقت پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دراوڑی لوگ بھی موجود ہیں (جیسے بلوچستان کے براہوی قبائل) اور آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں، اسی طرح منگول بھی ہیں اور سامی النسل بھی، بلوچ بھی ہیں اور افغان

بھی، حتیٰ کہ شمالی علاقہ جات میں شین بھی ہیں اور بلتی بھی! الغرض یہاں کسی ایک نسل کے لوگ ایسی غالب اکثریت میں موجود نہیں ہیں کہ نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر ملک کے استحکام کی توقع کی جا سکے۔

۲۔ لِسانی قوم پرستی

نسلی قوم پرستی کے بعد موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور قوی جذبہ (POTENT NATIONALISM) ـــــ لسانی قوم پرستی (LINGUISTIC NATIONALISM) کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کی بھی دو مثالیں قابلِ توجہ ہیں: ایک عرب نیشنلزم اور دوسرے بنگلہ نیشنلزم!

عرب نیشنلزم جو ماضیٔ قریب میں عالمِ عرب میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے موجود رہا ہے اصلاً ایک لسانی نیشنلزم ہے۔ اس لیے کہ اس کی اساس نہ مذہب پر ہے نہ نسل پر۔ بلکہ صرف اور صرف زبان پر ہے۔ چنانچہ اس کے حلقہ بگوش اور علمبردار صرف مسلمان ہی نہیں رہے ہیں بلکہ دانشوروں کی سطح پر اس میں زیادہ بھاری پلڑا عیسائیوں کا رہا ہے۔ حتیٰ کہ یہودی بھی اس میں شریک رہے ہیں، پھر اس میں نسل کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے اس لیے کہ شمالی افریقہ کے باشندوں میں جہاں عرب آبادکاروں کی اولاد شامل ہے وہاں قدیم قبطی اور بربر نسل کے لوگ بھی موجود ہیں۔ لیکن اِن سب کے باوجود محض زبان کے اشتراک نے ان سب میں مشترک قومیت کا احساس پیدا کیا اور خواہ اُس کے اساسی فلسفے سے ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عالمِ عرب نے یورپی استعمار کے خلاف جو جدوجہد کی اور جس کے بل پر اِس استعمار کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا اُس کی اصل اساس اِسی لسانی قوم پرستانہ جذبہ پر تھی!

اِسی طرح پاکستان کے دولخت ہونے میں جہاں منفی طور پر اولاً بے مقصدیت اور بے یقینی کے خلاء اور بعد ازاں مارشل لاء کے ردِّ عمل کو دخل حاصل ہے وہاں مثبت طور پر جو ہتھیار سب سے زیادہ کارگر اور جو دار سب سے بڑھ کر کاری ثابت ہُوا وہ بنگلہ نیشنلزم کا تھا جس کی اساس بنگلہ زبان پر قائم کی گئی تھی!

یاد ہو گا کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے دَوران تو چونکہ مقابلہ ہندو قوم اور ہندی زبان سے تھا لہٰذا مسلم قومیت اور اُردو زبان تقریباً لازم و ملزوم بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تقریباً مترادف اور ہم معنی ہو

گئے تھے لیکن قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان اُردو کے مدِمقابل کی حیثیت سے سامنے آگئی تھی۔ اور خود قائدِ اعظم کی زندگی کے دوران اِس مسئلے نے اتنی شدت اختیار کرلی تھی کہ اُنہیں اپنی تمام تر علالت اور نقاہت کے باوجود مشرقی پاکستان کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے نہایت توہین آمیز رویہ محض اس بات پر اختیار کیا تھا کہ انہوں نے خالص علمی انداز میں وہاں یہ فرمادیا تھا کہ کچھ عرصہ قبل بنگلہ زبان کا رسم الخط (SCRIPT) بھی وہی تھا جو عربی، فارسی، اُردو حتیٰ کہ سندھی، بلوچی اور پشتو کا ہے اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ دوبارہ بنگلہ زبان کا رسم الخط اُردو والا ہی اختیار کرلیا جائے تو لسانی بُعد و فصل میں کمی آجائے گی جس سے قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا! بہرحال پاکستان کی زندگی کے پہلے پچیس[۲۵] سالوں[1] کے دوران جہاں ایک جانب بے یقینی اور بے مقصدیت کا خلا مہیب سے مہیب تر ہوتا چلا گیا اور قومی و ملی سطح پر ضعف بڑھتا چلا گیا وہاں مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان، بنگلہ ادب، بنگلہ تہذیب اور بنگلہ ثقافت کے حوالے سے بنگلہ نیشنلزم قدم جماتا چلا گیا۔ اور بالآخر اسی کے منطقی نتیجے کے طور پر 'بنگلہ دیش' وجود میں آگیا۔ اور مشرقی پاکستان کا نام بھی دنیا کے نقشے سے غائب ہوگیا۔

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ زبان کا اشتراک لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان میں یگانگت پیدا کرنے میں نسلی اشتراک سے بھی زیادہ مؤثر اور سریع الاثر ہے۔ اس لیے کہ نسلی اشتراک کا تعلق اصلاً ماضی اور اُس کی روایات سے ہوتا ہے جبکہ لسانی اشتراک فی الفور محسوس و مشہود ہوتا ہے اور اپنی مادری زبان میں انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جس بے تکلفی سے اور جس بھرپور انداز میں کرسکتا ہے کسی دوسری زبان کو خواہ وہ کتنا بھی سیکھ لے اور اُس میں کتنی بھی مہارت حاصل کرلے اس میں جذبات کے اظہار کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ بنابریں اشتراکِ لسانی اجتماعیاتِ انسانیہ میں 'عصبیت' پیدا کرنے میں بہت دخیل اور مؤثر ہے۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ باقی ماندہ پاکستان میں وہ واحد زبان جو اس کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے صرف اور صرف اُردو ہے، تاہم اِس کا عمل دخل اتنا بہرحال نہیں ہے کہ اُسے ایک

---

[1] واضح رہے کہ اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک شمسی حساب سے تقریباً سوا چوبیس سال بنتے ہیں لیکن قمری حساب سے پچیس سال سے بھی کسی قدر زائد!

لِسانی قومیت کی بنیاد بنایا جاسکے۔ اور بنگلہ زبان کا مسئلہ ختم ہو جانے کے بعد موجودہ پاکستان میں کم ازکم ایک زبان ایسی موجود ہے جو کسی بھی طور سے اردو کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں! ہماری مُراد سندھی زبان سے ہے جس کی اساس پر 'سندھی نیشنلزم' ہوبہو 'بنگلہ نیشنلزم' کے خطوط پر پروان چڑھ رہا ہے۔ بلکہ واقعۃً ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ حتیٰ کہ بچے کھچے 'پاکستان' کو سب سے بڑا داخلی خطرہ اِسی سے لاحق ہے۔

یہ اِسی کا مظہر تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے تقریباً فوراً بعد لسانی فسادات کا لاوا سندھ میں پھٹ پڑا تھا جس سے مغربی پاکستان کی سالمیت کی چُولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ اور سقوطِ مشرقی پاکستان پر بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے جہاں یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا ہے"! (WE HAVE AVENGED ONE THOUSAND YEARS DEFEAT) جس سے پنڈت موتی لال نہرو ایسے بظاہر وسیع المشرب انسان کی پوتی اور پنڈت جواہر لال نہرو ایسے مذہبیت سے دُور اور سوشلزم کے پرستار کی بیٹی کی بھی خالص 'ہندوانہ ذہنیت' کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا وہاں ساتھ ہی اپنی قوم سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ "میں عنقریب ایک بہت بڑی خوش خبری اور سنانے والی ہوں"! جس سے یہ بات الم نشرح ہو گئی تھی کہ بقیہ پاکستان کی سالمیت بھی ہندو ذہن اور مزاج کیلئے کس درجہ ناقابلِ برداشت شے ہے! اِس لیے کہ اُس کے اِس وعدے کا مصداقِ خارجی ظاہر ہے کہ سندھ کے لسانی فسادات کے سِوا اور کوئی چیز قرار نہیں دی جاسکتی!۔

قصہ مختصر یہ کہ ہمارے پاس کُل پاکستان اساس پر کسی لسانی قومیت سے پیدا شدہ جذبۂ عمل تو درکنار، تاحال 'قومی زبان' کے مسئلے کا حل بھی موجود نہیں ہے۔

۳۔ وطنی قومیّت

وطن کی اساس پر قومیت کی تشکیل کا تصوّر زیادہ پُرانا نہیں ہے اور اِسے عہدِ جدید کی پیداوار قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ تاہم اِس وقت عالمی سطح پر کم ازکم نظری اور دستوری وقانونی اعتبار سے سب سے زیادہ چرچا اور سب سے بڑھ کر رواج اِسی کا ہے۔

منطقی اعتبار سے یہ بات بڑی وزنی (SOUND) نظر آتی ہے کہ اگر کسی ملک کے رہنے

والوں میں اپنے وطن سے قلبی محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ اُن کے احساسات و جذبات میں یک رنگی و ہم آہنگی اور فکر و عمل میں اتحاد اور یک جہتی کی بنیاد بن جائے گا اور اُنہیں ایک بنیانِ مرصوص کی صورت عطا کر دے گا۔ اور اس کے زیرِ اثر رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت کا فرق و امتیاز جو ملکوں اور قوموں کی کمزوری کا باعث بنتا ہے اگر بالکل ختم نہیں ہو گا تو کم از کم غیر اہم ضرور ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر میں قومیت کے تعین کے ضمن میں وطن ہی کو تقریباً متفقہ طور پر اساس تسلیم کر لیا گیا ہے (چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ایک موقع پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ "آج کل قومیں وطن کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں" جس پر نہایت سخت اور تیز و تند تنقید کی تھی مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے، جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا!) تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تاحال 'وطنی قومیت' کی جڑیں لوگوں کے احساسات و جذبات میں گہری اتری ہوئی نہیں ہیں اور جذبات کی دنیا میں اصل راج رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت ہی کا ہے، اور بالفعل 'وطنی قومیت'، صرف مُلکی دستور میں شہریت (CITIZENSHIP) کی اساس اور پاسپورٹوں پر قومیت (NATIONALITY) کے اندراج کے طور پر کام آتی ہے اور اس نے کسی مؤثر 'قوم پرستی' (NATIONALISM) کی صورت کہیں بھی اختیار نہیں کی۔

اس کے باوجود چونکہ پاکستان میں کسی قوم پرستانہ جذبہ کی پیدائش اور نشو و نما کے لیے نہ اشتراکِ نسل کی بنیاد موجود ہے نہ اشتراکِ زبان کی، لہٰذا اس کے ضمن میں کم از کم نظری طور پر کسی قوم پرستانہ جذبے کے لیے واحد دستیاب اساس (THE ONLY AVAILABLE BASIS) یہی رہ جاتی ہے اور غالباً اسی درجہ بدرجہ نفی کے عمل (PROCESS OF ELIMINATION) کا نتیجہ تھا کہ بانی و مؤسسِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہہ دیا تھا کہ: "عنقریب پاکستان میں نہ مسلمان مسلمان رہیں گے نہ ہندو ہندو رہیں گے مذہبی اعتبار سے نہیں، اس لیے کہ مذہب تو اشخاص کا انفرادی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم کے اعتبار سے"۔ قائدِ اعظم مرحوم کے ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور آیا ان الفاظ کو اُن کے سابقہ بیانات اور اعلانات کی نفی اور اپنے سابقہ مؤقف سے انحراف کا مظہر قرار دیا جائے یا اُن کے اعصاب پر اُس وقت کے حالات کی پیچیدگیوں اور سنگینیوں سے پیدا شدہ شدید دباؤ کا اثر سمجھا جائے؟ (جیسا کہ غلام احمد پرویز نے بالفعل

کیا ہے، اِس وقت ہمیں اِس سے بحث نہیں ہے اور اگرچہ اِس کے ضمن میں راقم الحروف کی ایک سوچی سمجھی رائے ہے جسے انشاء اللہ بعد میں بیان بھی کیا جائے گا تاہم موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے فی الوقت عرض یہ کرنا ہے کہ خواہ کوئی شخص اِس نتیجے پر، کہ پاکستان کے مسائل کا حل ایک وطنی نیشنلزم میں ہے، مجبوراً مُتذکرہ بالا PROCESS OF ELIMINATION سے پہنچا ہو خواہ وہ مثبت طور پر اسی نظریے کا ذہناً و قلباً قائل ہو حقیقتِ واقعی یہ ہے کہ 'پاکستانی نیشنلزم' نام کی کوئی شے نہ تاحال وجود میں آئی ہے نہ تاقیامت آسکتی ہے!!!

پہلی وجہ: دُو قومی نظریہ

اِس کی اوّلین اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ پاکستان دُو قومی نظریہ کی اساس پر وجود میں آیا تھا۔ جو وطنی قومیت کے نظریے کی کامل نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی ملک قائم تو ہو کسی نظریے کی کامل نفی کی اساس پر اور پھر اس کے استحکام کے لیے وہی نظریہ جڑ بنیاد کا کام دے سکے!

یاد کیجئے! کہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین اختلاف و نزاع کی اصل بنیاد کیا تھی؟ کانگریس کے نزدیک مذہب و ملّت کا معاملہ علیحدہ تھا اور قومیت کا علیحدہ، چنانچہ ہندوستان میں مذاہب بہت سے تھے لیکن اُن سب کے پیروؤں پر مشتمل قوم ایک ہی تھی یعنی انڈین نیشن یا ہندی قوم، جبکہ مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ یہ صورت دوسرے جملہ مذاہب کے پیروؤں کے نزدیک قابلِ قبول ہو تو ہو کم از کم مسلمانانِ ہند کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں، اِس لیے کہ اُن کی قومیت کی اساس مذہب پر ہے، لہٰذا وہ ایک علیحدہ قوم ہیں اور اپنے جُداگانہ قومی تشخص کے بقاء کی ضمانت کے طور پر علیحدہ ملک کے حق دار ہیں!

اِس موضوع پر خود قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بے شمار بیانات اور اعلانات مشہور و معروف ہیں جن کا دوہرانا محض تحصیلِ حاصل کا مصداق اور وقت اور قلم و قرطاس کے لاحاصل صَرف کا باعث ہوگا۔ البتہ اصولی اور اساسی اعتبار سے 'وطنی قومیت' کے نظریے پر جو کاری ضرب مفکر و مصوّرِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے لگائی تھی وہ یقیناً اِس قابل ہے کہ اُسے ذہنوں میں تازہ کیا جاتے۔ اِس لیے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک جُداگانہ قوم ہونے کے صرف تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی شواہد ہی پیش نہیں کیے تھے

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ضربِ ابراہیمی سے اِس باطل نظریے کے بُت ہی کو پاش پاش کر دیا تھا کہ ملکی سرحدیں مستقل قومیتّوں کی تشکیل کی بنیاد بن سکتی ہیں اور انسان محض زمینی تعلق کی بنا پر ایک دوسرے سے کٹ سکتا ہے: چنانچہ "وطنیت (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) کے عنوان سے فرماتے ہیں" :

"اِس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لُطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دِکھا دے!
اے مصطفوی! خاک میں اِس بُت کو مِلا دے!"

ذرا الفاظ کی گہرائی میں اُتر کر مفکّر و مصوّرِ پاکستان کے اس موضوع پر احساس کی شدّت کا اندازہ لگایا جائے تو بے اختیار غالبؔ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ

غرض کیجیے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا!

اِسی طرح مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے متذکرہ بالا جملے پر جو تلخ اور تیز و تند لیکن شعریت اور فصاحت و بلاغت کی معراج کے مظہر اشعار کہے تھے علامہ سر محمد اقبال نے وہ یہ تھے:

"عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر زِ مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

یہ دوسری بات ہے کہ جب مولانا مدنیؒ نے یہ وضاحت فرمائی کہ: اوّلاً انہوں نے لفظِ قوم کا استعمال کیا تھا ملّت کا نہیں! اور ثانیاً: انہوں نے صرف موجودہ دَور کی عام روش کا ذکر کیا تھا، نہ اُس کی وکالت کی تھی نہ ہی مسلمانوں کو اِس کے قبول کرنے کی تلقین کی تھی تو علامہ مرحوم نے فوراً اعتراف کیا کہ اِس پر اعتراض کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اپنے اشعار سے بھی رجوع کر لیا۔ اگرچہ اُن کے کلام کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ اشعار اب بھی شائع ہو رہے ہیں! (کاش کہ اِن کے اشعار کے ساتھ کلامِ اقبال کے طابع و ناشر متذکرہ بالا حقائق پر مشتمل ایک وضاحتی نوٹ بھی شائع کر دیا کریں)

قصّہ مختصر۔ وطنی قومیت کا نظریہ تحریکِ پاکستان کی نفی ہے اور اس کے فروغ سے پاکستان کی جڑیں مزید کھوکھلی تو ہو سکتی ہیں مضبوط نہیں ہو سکتیں!

دُوسری وجہ: مسلمانوں کی طبعی ساخت

دوسری نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ باعمل (PRACTICING) ہو خواہ بے عمل (NON-PRACTICING) ——— بہر حال اُس کے مزاج کی ایک مستقل ساخت ہے اور اُس کی طبیعت کی ایک خاص اُفتاد ہے جس میں زمین کی پرستش اور 'وطن' کے تقدّس کے تصوّر کی کوئی گنجائش نہیں ہے گویا اُس کی شخصیت کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے، اُس میں 'حبِّ وطن' کا مادّہ تو ہو سکتا ہے 'وطن پرستی' کا امکان نہیں ہے! پروفیسر مرزا محمد منور اِس حقیقت کو اِن خوبصورت الفاظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں کہ ہندو کلچر زمین میں گڑا ہُوا اور زمین سے بندھا ہُوا ——— (EARTH ROOTED AND EARTH BOUND) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں زمین "دھرتی ماتا" کی حیثیت رکھتی ہے اور "بھارت کی جے" کے نعرے سے اُن کے جذبات میں اُبھار اور احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے جبکہ مسلمان کے دل میں زمین کے مقدّس یا دیوتا ہونے کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے بلکہ اُس کا مزاج 'آفاقی' ہے اور اُس کے جذبات

میں گرمی اور احساسات میں ہلچل 'اللہ اکبر' کے نعرے سے ہوتی ہے! علامہ اقبال نے اپنی اُس نظم میں جس کے چند اشعار اُوپر نقل ہو چکے ہیں اِس 'قیدِ زمینی' کے تصور پر بھی نہایت زور دار تیشہ چلایا ہے ؎

"ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبِ الٰہی
دے تُو بھی نبوّت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے"!

برِّصغیر کے مسلمانوں کی خصوصیّت

اِس معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ 'برِّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو زیادہ ہی خصوصیت حاصل ہے اور ان کا مزاج کچھ زیادہ ہی 'آفاقی' ہے۔ اِس کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہاں کوئی دُوسری نسلی یا لسانی عصبیّت ایسی موجود نہیں تھی جو انہیں ایک دوسرے سے باندھ سکتی لہٰذا اپنی شیرازہ بندی کے لیے انہیں مذہب کی قوّتِ ماسکہ (BINDING FORCE) پر دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی انحصار کرنا پڑا اور چونکہ اسلام ایک علاقائی مذہب نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے۔ لہٰذا اُن میں 'آفاقیّت' دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سرایت کر گئی! اور یہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"! اُن کے قلوب و اذہان میں خوب رچ بس گیا اور اُن کے قومی شعور کا جزوِ لاینفک بن گیا!

چنانچہ بیسویں صدی عیسوی میں مغربی استعمار کے ہاتھوں عالمی ملّتِ اسلامیہ کو جو چرکے لگے اور صدمے سہنے پڑے اور جن مظالم کا نشانہ بننا پڑا اُن پر سب سے زیادہ درد انگیز نالے اور رقّت آمیز مرثیے ہندوستان کے مسلمانوں نے کہے اور اگرچہ وہ خود تو اُن مظالم و مصائب سے گزشتہ صدی کے دَوران دوچار ہو چکے تھے اور اب نسبتاً پُر امن ماحول اور قانونی و دستوری نظام میں زندگی گزار رہے تھے لیکن جب بھی دنیا کے کسی بھی کونے سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی خبر آتی تھی ہندوستان کا مسلمان بالکل اسی

شان کے ساتھ تڑپ اُٹھتا تھا جس کا نقشہ اِس شعر میں سامنے آتا ہے ؎

"خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

چنانچہ طرابلس میں مسلمانوں کے جھنڈے سرنگوں ہوتے تو عربی زبان میں درد انگیز مرثیہ کہا اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک اصلاً ہندی اور نسلاً راجپوت مسلمان عالم وعارف کتابِ الٰہی مولانا حمید الدینؒ نے ؎

"کَیْفَ الْقَرَارُ وَقَدْ نُکِس اَعْلَامُنَا بِطَرَابُلَس!"

(ترجمہ: قرار کیسے نصیب ہو جبکہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں سرنگوں کر دیئے گئے!)

اور اِسی طرح کے کتنے ہی درد بھرے مرثیے لکھے اُن کے بزرگ اور رشتے کے بھائی علاّمہ شبلی نعمانیؒ نے (علاّمہ شبلی اور مولانا فراہی آپس میں ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے!) پھر پوری اُمّتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روتے مولانا حالیؔ جنہوں نے اُمّت کے درد اور اصلاحِ احوال کی بے پناہ آرزو کے تحت اپنی شہرہ آفاق 'مسدس' لکھ ڈالی جس کے سرنامے کے یہ دو اشعار تو ابدی اور غیر فانی ہیں کہ

"پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے"

اور اِسی طرح آخر میں 'مناجات بحضور سرورِ کونینؐ' کے یہ دو اشعار بھی نہایت درد انگیز اور رقّت آمیز ہیں

"اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!"

پھر ذرا تصور کیجئے اُن جراٴت مندانہ اور ولولہ انگیز مضامین و مقالات کا جو پہلی جنگِ عظیم کے دَوران ترکوں کی حمایت میں نکلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سحر آفریں اور جذبہ پرور قلم سے اور شائع ہوئے 'الہلال' اور 'البلاغ' میں (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء) ——— پھر کون نہیں

جاننا کہ مسلمانوں کی عظمت وسطوتِ گزشتہ کے ضمن میں اس صدی کا سب سے بڑا نوحہ خواں، اُمّتِ مسلمہ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچنے والے دُکھ اور درد پر سب سے بڑھ کر درد انگیز نالے بلند کرنے والا اور آہ و فغاں کرنے والا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین وملّت کی نشاۃِ ثانیہ کے ضمن میں سب سے بڑا حُدی خواں بھی اِسی صنم خانۂ ہند سے تعلق رکھنے والا "برہمن زادہ" اور "کافرِ ہندی" تھا۔ بقول خود اُس کے ؎

"کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق وشوق
لب پہ صلوٰۃ و درود، دل میں صلوٰۃ و درود"

اور ع "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است!"

چنانچہ وہ کبھی جزیرۂ صقلیہ کو دیکھ کر خون کے آنسو رویا ؎

"رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار | وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرانشینوں کا کبھی | بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے | بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

غلغلوں سے جن کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟"

کبھی ہسپانیہ سے مخاطب ہو کر نوحہ کناں ہوا ؎

"ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے | مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں | خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

کیونکر خس وخاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب وتاب نہیں اُس کے شرر میں"

کبھی مسجد قرطبہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے باطنی سوز وگداز اور ذوق شوق کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے ؎

"اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود | عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز | تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں | تجھ سے حرم مرتبت اُندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حُسن کی تیرے نظیر | قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

دیدۂ انجم میں ہے تری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں !"

اور ساتھ ہی ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی نویدِ جانفزا دیتا دکھائی دیتا ہے ؎

"آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرہ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب"

اور کبھی طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی فاطمہ بنت عبداللہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جذباتِ ملّی کا اظہار کرتا ہے ؎

"فاطمہ ! تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے — ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی — غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اِس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے — نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے — ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اِس آغوش میں

تو کبھی ترکوں کے رنج و الم میں شریک ہو کر اور اُن کے مصائب پر اپنے کرب کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل قریب میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی خوشخبری بھی سُناتا ہے ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے — شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے | کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

اور اس کے لیے مسلمانوں کو جو پیغامِ عمل دیتا ہے اُس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ؎

"تُو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا!
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تُو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا"

الغرض مسلمانانِ برِ صغیر پاک و ہند کا مزاج ویسے تو ابتداء ہی سے آفاقی رہا ہے لیکن اِس صدی میں تو یہ کیفیت اپنے عروج کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اِس مزاج اور اُفتادِ طبع اور اِس اندازِ فکر و نظر کے وارثِ کامل اور حاملِ اَتم مسلمانانِ پاکستان کے قلب و نظر کی ایسی قلبِ ماہیّت کیسے ممکن ہے کہ زمینی تعلق اتنا مضبوط اور وطن کی پرستش اتنی گہری ہو جائے کہ ایک وطنی نیشنلزم (TERRITORIAL NATIONALISM) اس کے استحکام کی اصل اساس بن جائے!

اِس ضمن میں اِس تاریخی تجزیے پر بھی نگاہ رہے تو مناسب ہو گا کہ اِس صدی کے اوائل میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر ایک زبردست عوامی تحریک چلی صرف اور صرف ہندوستان میں! اور اِس تحریک کی تیزی اور تندی کا عالم یہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ پورے برِ صغیر کی فضا اِس شعر کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھی تھی کہ:

"بولیں اماں محمّد علی کی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو!"

بلکہ ہندوؤں تک کو اِس تحریک میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی۔ اِس لیے کہ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے شدّت کے ساتھ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اِس وقت اِس تحریک کا ساتھ نہ دیا تو پورا پولیٹیکل کیریئر ختم ہو کر رہ جائے گا!

تیسرا سبب: تقسیم در تقسیم کا اندیشہ

اِس ضمن میں تیسری اور آخری لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ اگر زمینی تعلق ہی کو قومی جذبہ کی بنیاد بنانے پر زور دیا جائے تو اِس سے اتحاد نہیں، انتشار وجود میں آئے گا۔ اِس لیے کہ یہ نظریہ ایک ایسے حیوان کے مانند ہے جو اپنے دشمن کو خود اپنے ہی دودھ سے پالتا ہے۔ چنانچہ 'وطنی قومیت' ہی کے بطن سے 'علاقائی قومیتیں' جنم لیتی ہیں اور اُسی کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پروان چڑھتی ہیں۔

اِس ضمن میں بھارت کا معاملہ اگرچہ پاکستان سے قدرے مختلف ہے کہ لفظ بھارت بھی کئی ہزار سال پُرانا ہے اور 'مہا بھارت' کا تصور بھی نہایت قدیم ہے۔ جبکہ، جیساکہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، پاکستان کا تو نام ہی حادثِ محض ہے، اِس کے باوجود 'وطنی قومیت' کے نظریے میں تقسیم در تقسیم کے جو بیج بالقوہ (POTENTIALLY) ـــــــ موجود ہوتے ہیں اُس کا نقشہ وہاں بھی نظر آ رہا ہے اور علاقائی قومیتیں اور مقامی عصبیتیں نسلی اور لسانی عوامل سے مزید تقویت پاکر نہایت تیزی اور تندی کے ساتھ سر اٹھا رہی ہیں اور بھارتی قیادت کو اپنی ملکی وحدت وسالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم و مسلسل اور شدید و جاں گُسل محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کا معاملہ بے حد نازک اور کمزور ہے۔ اِس لیے کہ پاکستان کا تو تصور بھی پچاس سال سے زیادہ کی تاریخ نہیں رکھتا۔ اور کم ازکم اِس نام کے ساتھ کبھی سیاسی وحدت اور اُس کی عظمت وسطوت کی کوئی تاریخ موجود نہیں لہٰذا اگر اِس کی اساس پر وطنی قومیت کا راگ الاپا گیا تو اصل تقویت سندھی، بلوچی، پختون اور پنجابی قومیتوں کو حاصل ہو گی۔ اِس لیے کہ اگر فی الواقع زمینی رشتہ ہی مقدس ہے تو ایک سندھی کے لیے سندھ کے وطن ہونے کا تصور زیادہ قریبی بھی ہے اور قدیمی بھی! پھر اِس کو تقویت دینے کے لیے خاص طور پر لسانی عامل موجود ہے جو نہایت قوت کا حامل ہے! اور ظاہر ہے کہ پاکستان کا لفظ بھی نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں، اور اِس کی حدود بھی ہرگز نہ کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں نہ اُن پر مبنی، تو پھر اگر وطن ہی کو 'پوجنا' ہے تو سرزمینِ سندھ کو کیوں نہ 'پوجا' جائے۔ وَقِسْ عَلٰی ذَالِکَ!

بقول غالب ؎ "وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟"

اِس پُوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیے نہ 'تاریخی

تقدس' کا عامل موجود ہے نہ ہی جغرافیائی عوامل' اس کے پُشت پناہ ہیں' پھر کوئی نسلی' لسانی یا وطنی قومیت کا جذبہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس کے استحکام کے لیے پختہ اساس اور سنگین بنیاد کا کام دے سکے ـــــ لہٰذا اس کے استحکام کا کُل دار و مدار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ وہی ہے جس نے اسے جنم دیا تھا ـــــ یعنی 'مذہبی جذبہ' ۔!! گویا پاکستان کا معاملہ بالکل ع "کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو!" والا ہے کہ اگر اسے اپنی بقا مطلوب ہے اور یہ کسی دوسری طاقت کا طفیلی یا زیر دست بن کر نہیں بلکہ باوقار اور باعزّت اور حقیقتاً آزاد اور خود مختار ہو کر باقی رہنا چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی اور چارۂ کار سرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ اسلام کا دامن تھامے اور اُسی کا سہارا لے۔

یہ بات ہر اُس شخص کے لیے اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے جو کسی بھی وجہ سے پاکستان کے بقاء و استحکام کا طالب اور خواہشمند ہو۔ اس لیے کہ اگر کوئی بدبخت کسی سبب سے اپنے ذہن و قلب سے پاکستان کو بالفعل 'محو' (WRITE – OFF) ـــــ کر ہی چکا ہو تو بات دوسری ہے' اُس کے لیے تو ہماری یہ پوری بحث ہی غیر متعلق بھی ہے اور لایعنی بھی' لیکن جو شخص بھی دل سے پاکستان کا بقاء و استحکام چاہتا ہو اُس کے لیے انشاء اللہ العزیز ہمارا یہ تجزیہ فیصلہ کُن ثابت ہو گا اور وہ اس حقیقت کو جان لے گا کہ اگرچہ عوام کی فلاح و بہبود' انتظامی مشینری کی اصلاح و تطہیر اور مختلف علاقوں کے رہنے والوں اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں کا اعتماد و اطمینان بھی نہایت اہم اُمور ہیں اور ان کے بغیر بھی یقیناً پاکستان مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اور خاص طور پر موجودہ حالت میں تو ان کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی ہے اور ان اُمورِ ثلٰثہ کے ضمن میں جو شدید کوتاہی مسلسل ہو رہی ہے اگر جلد از جلد اُس کی تلافی کی صورت پیدا نہ ہوئی تو شدید اندیشہ ہے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!" کا مصداق بن جائے۔ تاہم پاکستان کے دوام و استحکام کی اصل اساس یہ چیزیں نہیں بلکہ صرف اور صرف اسلامی جذبہ ہے اور اگر وہ جلد از جلد بھرپور انداز میں بروئے کار نہ آیا تو باقی تمام چیزوں کی اصلاح کے باوجود پاکستان یا تو اپنی سالمیت ہی کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور اس کے حصے بخرے ہو جائیں گے یا اگر باقی رہے گا بھی تو کسی دوسری بڑی طاقت کا

طفیلی یا زیر دست ہو کر!

اب اِس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں اور تفصیل کے ساتھ عرض کریں کہ وہ مذہبی جذبہ جو اُب پاکستان کے استحکام کی حقیقی اور واقعی، اور مضبوط اور پائدار بنیاد بن سکتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً مختلف ہے اُس 'مذہبی جذبے' سے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا اور جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل تحریک پاکستان کی رُوحِ رواں بنا تھا۔ راقم قائدِ اعظم مرحوم کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے جلسے کے بارے میں اپنی توجیہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

راقم کے نزدیک قائدِ اعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر تھا۔ اِس لیے کہ قائدِ اعظم مرحوم خواہ ایک 'مذہبی شخصیت' نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاستدانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے اور اُن کے کردار کی مضبوطی، سیرت کی پختگی، ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں۔ اِسی طرح اُن کا وہ متنازعہ جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متاثر ہو جانے کا بھی مظہر نہیں تھا، اِس لیے کہ قائدِ اعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے بلکہ وہ واقعتہً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور بُرے سے بُرے حالات میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ راقم کے نزدیک اُن کے اِس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق مؤقف کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیشِ نظر اولاً برِصغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب، تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال حاصل ہو گئی اور ان چیزوں کے ضمن میں ہندوؤں کے نامنصفانہ بلکہ منتقمانہ رویّے سے پیدا شدہ خطرات کا سدِّباب ہو گیا، ثانیاً پاکستان میں واقعتہً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیشِ نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کُن اکثریت میں ہیں، واقعتہً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتہً اور واقعتہً اسلامی تہذیب و تمدّن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اجراء کے خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اُن کے اجتماعی ارادے (COLLECTIVE WILL) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی، لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور

چوکنا کردینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارادارومدار کثرتِ رائے پر ہوتا ہے لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقۃً جمہوری نظام قائم ہوجائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی!

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائدِ اعظم کی اِس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اِس طریق کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانونِ اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے لیکن اِس توجیہہ سے وہ سارے اِشکال حل ہوجاتے ہیں جو اِس جملے کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا۔ هٰذَا مَا عِنْدِي وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللهِ!

کون سا اِسلام ؟

گزشتہ مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ پاکستان پوری دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی 'ولدیت' صرف اور صرف اسلام ہے۔ چنانچہ یہ قائم بھی دین و مذہب کے نام پر ہوا اور اس کے بقاء و دوام اور ترقی و استحکام کے لیے بھی نہ تاریخی تقدس کا عامل موجود ہے، نہ فطری جغرافیائی حدود کا حفاظتی ذریعہ اور نہ ہی دنیا کے معروف اور مروجہ معیارات کے مطابق کوئی قوم پرستانہ جذبہ۔ بلکہ اُسے مضبوط اور مستحکم اور ناقابلِ تسخیر بنا سکتا ہے تو صرف اور صرف مذہبی جذبہ! تو آیئے کہ اب ہم اُس مذہبی جذبے کی نوعیت اور خد و خال معین کرنے کی کوشش کریں جو پاکستان کے بقاء و استحکام کی مضبوط اور پائدار اساس بن سکتا ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام کی کون سی تعبیر اُس مذہبی جذبے کی پیدائش و افزائش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ا۔ قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی اور عملی

اس ضمن میں اولین اور اہم ترین حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقاء و استحکام کا ضامن بن سکتا ہے بنیادی طور پر مختلف ہے اُس مذہبی جذبے سے جو اُس کے وجود میں آنے کا سبب بنا تھا۔ اِس لیے کہ اُس وقت مقابلہ غیر مسلموں سے تھا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کا سا نام رکھتا تھا، قومی تحریک میں نہ صرف شامل اور شریک ہو سکتا تھا، بلکہ اُس کے قائدین تک کی صفوں میں بار پا سکتا تھا، قطع نظر اس سے کہ اُس کے واقعی نظریات کیا تھے اُس کے اخلاق اور کردار کا عالم کیا تھا اور وہ اسلام کے بنیادی احکام تک پر عمل پیرا تھا یا نہیں، حتیٰ کہ

ارکانِ اسلام تک کا بھی پابند تھا یا نہیں ہے چنانچہ اُس وقت "پاکستان کا مطلب کیا ہے لاالٰہ الاّ اللہ" کے بعد سب سے زیادہ مقبول نعرہ یہی تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"

واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت کی کشمکش میں ہمارے اندر اپنے مسلمان ہونے کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ خود ہندوؤں کے طرزِ عمل اور رویتے کے باعث پیدا ہو رہا تھا کہ جہاں کسی مسلمان کا ہاتھ اُن کے برتن کو چھُو گیا وہ "بھرشٹ" یعنی ناپاک ہو گیا۔ خواہ وہ مسلمان کتنا ہی صاف ستھرا اور نہایا دھویا کیوں نہ ہو اور وہ ہندو خود کتنے ہی گندے اور میلے کچیلے کیوں نہ ہوں! چنانچہ ہر ریلوے سٹیشن پر پینے کا پانی بھی اِس شان سے جُدا تھا کہ اگر "مسلمان پانی" پلیٹ فارم کے ایک سرے پر ہوتا تھا تو "ہندو پانی" اُس کے بالکل بالمقابل دوسرے سرے پر۔ پھر خاص طور پر معاشی اور اقتصادی میدان میں ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، اُن کی چبھن اور کسک کو ہر مسلمان تاجر یہاں تک کہ کھوکھے والے اور خوانچہ فروش تک اور جُملہ سرکاری ملازم یہاں تک کہ چوکیدار اور چپڑاسی تک محسوس کر رہے تھے۔ گویا کہ اُس وقت کے "مسلم نیشنلزم" میں جہاں مثبت اور حقیقی عوامل بھی کارفرما تھے وہاں ایک اہم اور مؤثر عنصر ابنائے وطن کے رویتے کا ردِّ عمل (REACTION) بھی تھا۔

اِس ضمن میں نومبر ۱۹۲۰ء میں علماءِ ہند کے دُوسرے کُل ہند اجلاس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں جو کچھ فرمایا تھا مولانا حسین احمد مدنیؒ کے استاذ اور مربّی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے اُس کا مطالعہ بہت مفید اور بہت سوں کے لیے "انکشافِ حقیقت" کا ذریعہ بنے گا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا تھا:

"ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اُن سے کوئی رخنہ نہ پڑنے جس کی صُورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہ اختیار کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذارسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے

مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپئے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی تعداد سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے[1]"!

ذرا اندازہ فرمایئے حضرت شیخ الہندؒ کی دُور اندیشی اور ژرف نگاہی کا کہ یہ ۱۹۲۰ء کا دور ہے۔ جبکہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بظاہر شیر و شکر ہیں اور تحریکِ آزادی میں قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ شریک ہیں اور خود محمد علی جناح جو اُس وقت تک 'قائدِ اعظم' نہیں بنے تھے ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور محبت و یگانگت کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہیں لیکن وہ مردِ درویش اُس ظاہری رواداری کے پردے میں ہندو کی اصل ذہنیت کا اندازہ کر چکا ہے اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تنبیہ کر رہا ہے کہ اگر برادرانِ وطن کا رویّہ یہی رہا تو ہمیں بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔

اِس کے فوراً بعد آتا ہے تحریکِ خلافت کا طوفانی اور ہیجانی دور جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حاشیہ بردار اور تابع (CAMP FOLLOWER) بننے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُس جذباتی اور ہنگامی دور میں تو مسلمان اور ہندو واقعۃً شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ لیکن جب تحریکِ خلافت دفعتاً بالکل اُسی انداز میں ختم ہو جاتی ہے جیسے تیز بخار پسینہ آنے سے یکدم اُتر جاتا ہے تو صورتِ حال میں ایک فوری تبدیلی آتی ہے کہ ایک جانب مسلمانوں میں شدید دل شکستگی کی کیفیت پیدا ہوتی، اُن کے ولولے سرد پڑے اور ایک عام بددلی اور مایوسی کی فضا طاری ہو گئی اور دوسری جانب (غالباً مسلمانوں کی اِس عمومی کیفیت ہی سے حوصلہ پاکر) ہندو ذہنیت کھُل کر سامنے آئی۔ چنانچہ کہیں اُس نے 'شدھی اور سنگھٹن' کا رُوپ دھارا تو کہیں 'واردھا اسکیم' کی صورت اختیار کی' اور کہیں 'ہندو مہاسبھا' کی شکل میں

---

[1] (بحوالہ 'بیس بڑے مسلمان' تالیف مولانا عبدالرشید ارشد' ص۲۹۱)

ظہور کیا تو کہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ نتیجۃً ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے شدید ترین دور کا آغاز ہو گیا اور مسلم قوم پرست تحریک اپنے نقطۂ عروج کی جانب تیزی کے ساتھ منزلیں طے کرتے ہوئے بڑھنے لگی۔ اِس طرح کم از کم مسلمانانِ ہند کے ضمن میں ہندو کی تنگ نظری اور استحصالی ذہنیت کے بارے میں وہ بات کمالِ صداقت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے جو علامہ اقبال نے یورپی استعمار کے بارے میں کہی تھی:

ع "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے"

اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں ہندوؤں کے اِس طرزِ عمل پر بجا طور پر اُن کا شکریہ ادا کیا جا سکتا ہے کہ ؎

تُو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے

بہر حال اِس گھمسان کے رَن میں ظاہر ہے کس کے پاس فرصت تھی اور کسے ہوش تھا کہ یہ دیکھے کہ کون اسلام پر واقعۃً عمل پیرا ہے اور کون اُس کے کم از کم لوازم و شرائط پر بھی پورا نہیں اُترتا۔ اُس وقت تو واحد امتیاز کلمۂ شہادت کا تھا کہ کون کلمہ گو ہے اور کون نہیں! چنانچہ تحریکِ پاکستان کی اساس مسلم قومیت قرار پائی نہ کہ اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی تعلق اور یہ ہتھیار واقعۃً اُس وقت بہت کارگر اور مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ اُسی کی اساس پر تحریک نے عوامیت اختیار کی اور کامیابی حاصل کر لی اور قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' ظہور میں آگیا۔

تقسیم کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ مغربی پاکستان میں ہندو نہ ہونے کے برابر رہ گئے اور جو رہ گئے انہوں نے بھی کم از کم وقتی طور پر گویا دم سادھ لیا۔ چنانچہ ہندو مسلم کشمکش مغربی پاکستان کی حد تک بالکل ختم ہو گئی۔ رہے بھارت کے حالات تو وہ بین الاقوامی سرحدوں کے پردوں میں چھپ کر "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کے مصداق بن گئے۔ نتیجۃً جب تک تقسیم کے وقت کے زخموں میں ٹیسیں اُٹھتی رہیں اور کسک باقی رہی سابقہ کشمکش کی یاد بھی برقرار رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ اُس کے اثرات بھی زائل ہو گئے اور یاد بھی باقی نہ رہی۔ رہا مشرقی پاکستان تو وہاں اگرچہ ایک فعال اور مؤثر ہندو اقلیت قابلِ لحاظ تعداد میں موجود تھی لیکن اُس نے کمال ہوشیاری اور چابکدستی سے کام لے کر وہاں کی مسلم اکثریت کے مسابقت اور مقابلے کے جذبے کا رُخ اپنی جانب سے پھیر کر مغربی پاکستان کی طرف کر دیا اور خود خاموشی کے ساتھ ایک بغلی دشمن

کے انداز میں ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے تصور کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے میں لگ گئے جس کا نتیجہ پچیس سال کے اندر اندر پاکستان کی شکست اور بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا جس پر پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلے اور انہیں یہ کہنے کا موقع ملا کہ دو قومی نظریہ باطل (FALSE) ثابت ہو گیا ہے! اور اس کے بعد یہی طریق کار ——— (STRATEGY) ٹُبے کچھے پاکستان میں چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ کی ہندو اقلیت اپنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس نے بھی سندھ کی قدیمی مسلمان آبادی کی اکثریت کی مخالفت اور نفرت کا رُخ پنجاب کی جانب موڑ کر خود ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے دامن میں پناہ لی ہوئی ہے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے کہ 'سندھو دیش' کی تحریک بھی سندھ کی نوجوان نسل کے معتدبہ حصے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ واللہ اعلم

بنابریں اب وہ مسلم قوم پرستی جس کے شعور کی گیرائی و گہرائی میں ایک فیصلہ کن حصہ برِصغیر کی ہندو مسلم کشمکش کی شدت کا تھا ایک مؤثر اور قابلِ لحاظ عامل کی حیثیت سے موجود ہی نہیں ہے۔ گویا مذہبی جذبے کی وہ قسم جو پاکستان کے قیام کا ذریعہ بنی تھی اب نہ صرف یہ کہ غیر مؤثر اور دور از کار ——— (OBSOLETE) ہو چکی ہے بلکہ فی الواقع موجود ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی نئی نسل کو نہ صرف یہ کہ ہندو ذہنیت کا کوئی تجربہ نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس اُسے تو آئے دن محبت کے اُن 'زمزموں' سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جو سرحد پار سے ہوا کے دوش پر ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پہنچتے رہتے ہیں یا جن کی یلغار مسلسل دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں اور صحافیوں ——— اور سب سے بڑھ کر ثقافتی طائفوں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اب پاکستان میں عمودی (VERTICAL) اور اُفقی (HORIZONTAL) تقسیم اور محاذ آرائی (POLARISATION) نے خود پاکستانی مسلمانوں کو باہم منقسم اور ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک جانب علاقائی، لسانی اور ثقافتی تقسیم کی گہرائی اور گیرائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب طبقاتی تقسیم کا شعور بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اب پاکستان کے مسلمانوں میں مقاصد کی یک جہتی اور ہم آہنگی صرف مسلم قومیت کے تصور اور محض قوم پرستانہ جذبے کی بنیاد پر پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اب انہیں کوئی شئے "بنیانِ مرصوص" (یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار[1]) بنا سکتی ہے تو صرف وہ مذہبی جذبہ ہو سکتا ہے جو اُس اسلام کے ساتھ حقیقی تعلق

---

[1] سورۃ الصّف آیت نمبر ۴

اور کردار و عمل کے واقعی رشتے سے پیدا ہو اور اُسی سے غذا حاصل کرے اور نشوونما پائے!

یہی بات راقم نے ایک ملاقات میں پاکستان کے بزرگ صحافی جناب زیڈ اے سلہری سے عرض کی تھی کہ آپ کا تقریباً ہر مضمون 'دو قومی نظریے' (TWO NATION THEORY) پر مبنی ہوتا ہے اور آپ کی ہر تحریر کی تان لازماً 'مسلم قومیت' (MUSLIM NATIONHOOD) پر ہی ٹوٹتی ہے ـــــ تو جہاں تک اِس حقیقت کا تعلق ہے کہ پاکستان اسی کی بنیاد پر قائم ہوا تھا تو میرے خیال میں کوئی نہایت ہی ڈھیٹ قسم کا انسان ہی ہو گا جو اِس سے انکار کی جرأت کرے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس انداز سے آپ اس کی تکرار کر رہے ہیں، اُس سے تو اُلٹا اِس شک کے پیدا ہونے کا امکان ہے کہ پاکستان کی 'ایجاد و تکوین' (GENISIS) کے ضمن میں شاید کوئی اور دوسرا قوی تر نظریہ بھی موجود ہے جس کی اِس تکرار اور اعادے اور شدّومد کے ساتھ نفی اور تردید کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اصل قابلِ غور اور اہمیت کی حامل حقیقت یہ ہے کہ محض مسلم قومیت اب پاکستان کے بقا و استحکام کی ضامن نہیں بن سکتی۔ جب تک اُس میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ نمایاں طور پر نظر نہ آئے اور فعل و عمل کی رُوح واضح طور پر جاری و ساری محسوس نہ ہو!

۲۔ جدید دانشورانہ اسلام نہیں، بلکہ علماء کا مصدّقہ اِسلام!

دوسری اہم اور بنیادی بات جو اُس مذہبی جذبے کے بارے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے جو پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے ٹھوس بنیاد بن سکے یہ ہے کہ وہ اسلام کی کسی جدید دانشورانہ تعبیر کے ذریعے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُس کے لیے اسلام کی صرف وہی تعبیر مؤثر اور کارگر ہو گی جو صدیوں کے تعامل اور 'روایت' کی بنا پر مسلمانوں کے 'اجتماعی شعور' (COLLECTIVE CONSCIOUSNESS) کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے۔ اور جسے اُن علماء کرام کی تصدیق حاصل ہے جن پر دین و مذہب کے معاملے میں مسلمان عوام کی عظیم اکثریت اعتماد کرتی ہے۔ اس لیے کہ موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے ہم ایک ایسے جذبے کی بات کر رہے ہیں جو عوام میں ذہنی، فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرے اور اُن کو محنت و مشقت

اور ایثار و قربانی پر آمادۂ (MOTIVATE) کر سکے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد کسی جدید تعبیر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ جدید تعبیرات اور دانشورانہ تصورات تو زیادہ سے زیادہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) بلکہ اُس کے بھی ایک حصّے ہی کو متاثر کر سکتے ہیں، عوام کے قلوب و اذہان کو بڑے پیمانے پر مسخر نہیں کر سکتے ـــــــ اور جب تک جذبہ و امنگ کا عوامی سطح پر ظہور نہ ہو ہمارا مقصود، یعنی پاکستان کے مسلمانوں کا ایک بنیانِ مرصوص بن کر ناقابلِ تسخیر قوت کی صورت اختیار کر لینا، حاصل نہیں ہو سکتا۔

اِس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ بہت سے بدنما داغوں اور دھبّوں کے باوجود بالکل 'تاریک' نہیں ہے اور اس کے دوران سیاسی مدّ و جذر اور حکومتی سطح پر ردّ و بدل، مھتوڑ پھوڑ اور آمد و رفت کے باوصف ایک تہذیبی اور ثقافتی تسلسل موجود رہا ہے جس میں اصل عمل دخل دو طبقوں کے اثر و نفوذ کو حاصل رہا ہے: ایک علماءِ کرام اور دوسرے صوفیاءِ عظام۔ اور خواہ مسلمانوں کے جسموں پر حکومت امراء و سلاطین کی رہی ہو اُن کے قلوب و اذہان اور احساسات و جذبات پر علماء اور صوفیاء ہی کی سیادت و قیادت کا سکّہ چلتا رہا ہے اور اجتماعیات و عمرانیات پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کیفیت پورے عالمِ اسلام کی بہ نسبت مسلمانانِ برِّصغیر میں شدید ترین صورت میں موجود ہے۔ اور یہاں کا مسلمان خواہ کسی خارجی جبر کے باعث یا نفسِ امّارہ کے داخلی دباؤ کے تحت خود اس اسلام پر پوری طرح عمل پیرا اور کاربند نہ ہو جو علماءِ کرام پیش کرتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے قائل اُسی کا ہے۔ اور یہ صرف چودھویں صدی ہجری کے نصف کے بعد ہوا کہ مسلمانوں کی عوامی سیاست کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو دین و مذہب سے کوئی گہرا عملی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تاہم اِس سلسلے میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ اس قیادت کو عملاً عوامی پذیرائی اُس وقت حاصل ہوئی جب اُسے مسلّم حیثیت کے حامل مشائخ اور علماء کی معتدبہ تعداد کی تصدیق اور سند حاصل ہو گئی ـــــــ بنابریں وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقاء و دوام اور ترقی و استحکام کا ضامن بن سکتا ہے نہ دین و مذہب کی کسی جدید تعبیر کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے نہ کسی نئے دانشورانہ تصور کی اساس پر۔ بلکہ اس کی پیدائش و افزائش کا کوئی امکان اگر ہے تو دین و مذہب کے صرف اور صرف اُن تصورات اور تعبیرات کی بنا پر ہے جن کی 'اسلامیت'، نہ صرف یہ کہ مسلمان عوام کے اجتماعی شعور کے نزدیک مسلّم اور قابلِ قبول ہو بلکہ اُن کے تحت الشعور میں رچی بسی ہوئی ہو کہ

اُن کے لاشعور تک میں نفوذ کیے ہوتے ہو۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ تعبیرات اور تصوّرات وہی ہو سکتے ہیں جنہیں علماء کی تصدیق حاصل ہو۔

اِس سلسلے میں اِس خیال کو بھی دِل سے نکال دیا جائے کہ علماء تو خود آپس میں دست و گریباں ہیں اور اُن کے درمیان اتنے شدید اختلافات موجود ہیں کہ خود جمع نہیں ہو سکتے تو اُن کے مُصدّقہ تصورات قوم کو کیسے جمع کر دیں گے ؟ اِس لیے کہ اگرچہ اِس حقیقت سے تو کلّی انکار ممکن نہیں ہے کہ ہمارے یہاں جہاں علمائے حق معتد بہ تعداد میں موجود ہیں وہاں ایسے 'علماءِ سوء' کی بھی یقیناً کمی نہیں ہے جو خالصتاً "بَغْيًا بَيْنَهُمْ" کی بنا پر[1] یعنی آپس کی ضدم ضدا اور ایک دوسرے پر برتری اور فوقیت کے حصول کے لیے مسلمانوں کے فروعی اختلافات کو ابھارتے ہیں اور انہیں آپس میں لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں، تاہم پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دوران بحیثیتِ مجموعی علماءِ کرام کا کردار مثبت اور منفی دونوں اعتبارات سے یعنی مثبت طور پر پاکستان میں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ و اجراء اور منفی اعتبار سے اسلام کے مسلّم اعتقادات و تعلیمات کے خلاف اُٹھنے والے فتنوں کے سدِّباب دونوں پہلوؤں سے ہرگز مایوس کُن نہیں بلکہ بحمداللہ نہایت روشن اور تابناک رہا ہے۔ چنانچہ ایک جانب جب دستور سازی کے ضمن میں ایوانِ اقتدار سے یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ پاکستان میں کس کا اسلام نافذ کیا جائے۔ شیعہ یا سُنّی کا؟ اہل حدیث کا یا حنفی کا؟ اور بریلوی کا یا دیوبندی کا؟ تو اِس چیلنج کے جواب میں جملہ مکاتبِ فکر کے ۳۱ سربرآوردہ علماءِ کرام نے کامل اتفاقِ رائے کے ساتھ ۲۲ نکاتی فارمولا پیش کر کے وہ حجّتِ قاطع قائم کر دی تھی جو اَب تک قائم ہے اور جس کا جواب بعد میں کسی سے بھی بن نہیں آیا ——— اِسی طرح عقیدۂ ختمِ نبوت کی فصیل میں نقب لگانے والوں کے خلاف ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں دو بار جملہ مسلکوں اور فرقوں کے علماءِ کرام نے جس اتحاد و اتفاق کا ثبوت دیا وہ بھی ہماری تاریخ کا نہایت تابندہ و درخشندہ باب ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بالکل یہی کیفیت ہمارے یہاں فتنۂ انکارِ حدیث کے ضمن میں بھی پائی جاتی

---

[1] یہ الفاظ قرآن حکیم میں چار مقامات پر باہمی جنگ و جدال اور تشتّت و انتشار کے اصل سبب کی تعیین کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں (دیکھئے سورۃ بقرہ آیت نمبر ۲۱۳، سورۃ آلِ عمران آیت نمبر ۱۹، سورۃ شوریٰ آیت نمبر ۱۴، اور سورۃ جاثیہ آیت نمبر ۱۷)

ہے[1] ——— ایک اتنی ہی عظیم مثال یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب منکرینِ حدیث و سُنّت، دلدادگانِ آیاتِ ——— اور قائلینِ نظریۂ مساواتِ مرد و زن کے دباؤ کے تحت سابق صدر ایوب خاں نے بدنامِ زمانہ عائلی قوانین نافذ کیے تو اُن کے خلاف شیعہ و سنی، اہلحدیث و حنفی، اور دیوبندی و بریلوی جملہ مکاتبِ فکر کے بارہ[12] چوٹی کے علماء و مجتہدین کے علاوہ جماعتِ اسلامی کے سربراہ اور بعض دوسرے ملی رہنماؤں نے ایک طویل تنقیدی تحریر پر دستخط ثبت کر کے فرقہ وارانہ اختلافات کے غبارے میں سے ہوا نکال کر رکھ دی تھی!

——— اس پر مستزاد ہیں یہ دو مثالیں کہ اولاً آج سے تین چار سال قبل جب راقم کے ایک اخباری انٹرویو میں ستر و حجاب سے متعلق اسلام کے احکام بیان ہوئے اور اُس پر ملک بھر میں اباحیت پسند اور مغرب زدہ خواتین و حضرات نے طوفان برپا کر دیا تو بلالحاظِ مسلک و مشرب پاکستان کی ہر مسجد کے محراب و منبر سے میری تائید میں آواز بلند ہوئی اور اگرچہ جدید دانشور حضرات و خواتین نے میرے خلاف مضامین کا طومار باندھ دیا جو قومی اخبارات کے رنگین صفحات میں جلی سُرخیوں اور دیدہ زیب حاشیوں کے ساتھ شائع ہوئے لیکن بالآخر خود اسی حلقے کے ایک نمایاں دانشور اور صحافی (جناب صفدر میر) کو یہ کہنا پڑا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار نے حصولِ مقبولیت کے فن پر بہت کتابیں پڑھی ہیں تو اس سے قطع نظر کہ راقم نے زندگی بھر اس موضوع پر کوئی کتاب پڑھنا تو کجا دیکھی بھی نہیں ——— اُن کے یہ الفاظ درحقیقت مظہر ہیں اُن کے اِس اعتراف کا کہ پاکستان کے مسلمان عوام خواہ خود اُس پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہوں لیکن بہرحال قائل اُسی اسلام کے ہیں جسے علماءِ کرام کی تائید و توثیق حاصل ہے ثانیاً جب مُلک میں قانونِ شہادت اور قانونِ قصاص و دیت کی بحث چھڑی تو اُس کے ضمن میں پھر یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ علماءِ کرام اپنے تمام تر اختلافات کے علی الرّغم اسلامی قانون اور اُس کی فروعات تک کے ضمن میں بالکل متحد و متفق ہیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص مکتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے ایک ایسے جدید دانشور کی تردید و تغلیط میں بھی کوئی تامّل نہیں کیا جو اپنے آپ کو خود اُنہی کی جانب منسوب کرتے ہیں! قصّہ مختصر یہ کہ پاکستان کے مسلمان عوام کی عظیم اکثریت کو آمادۂ عمل (MOTIVATE) کر کے اُنہیں

---

[1] ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اِن دونوں فتنوں کے ڈانڈے باہم ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر نبوت و رسالت کا خاتمہ و تکمیل اور اُس کے لازمی منطقی نتیجے کے طور پر اب ابداً لآباد تک آپؐ کی سُنّت کی حجیت اور آپؐ کے اتباع کا لزوم ہی تجدد پسندی اور مغرب پرستی کی راہ کے اصل پتھر ہیں اور یہ دونوں فتنے درحقیقت ان ہی سے گلوخلاصی کی دو بظاہر قدرے مختلف صورتیں ہیں۔

ایک بنیانِ مرصوص اور ناقابلِ تسخیر قوت بنا دینے کی صلاحیّت و استعداد صرف اُس مذہبی جذبہ میں ہے جو اسلام کے اُس تصور کی بنیاد پر اُبھرے جسے علماءِ کرام کی تصدیق و تصویب حاصل ہو۔

۳۔ جامد مذہبیت نہیں بلکہ انقلابی دینی جذبہ

اُس مذہبی جذبے کی عرضِ ثالث (THIRD DIMENSION) جو پاکستان کے دوام و استحکام کی مؤثر و محکم بنیاد بن سکتا ہے یہ ہے کہ اِس میں 'جمُود' کی بجائے 'حرکت' اور اجتماعی نظام کو جوُں کا توُں رکھنے یعنی STATUS QUO کو MAINTAIN کرنے کی بجائے تبدیلی اور انقلاب کی رُوح کارفرما ہو۔ اِس لیے کہ پاکستان کا داخلی انتشار اور اس کی یک جہتی و سالمیت اور باوقار و باعزت آزادی و خود اختیاری کے خلاف خارجی یلغار دونوں کی نوعیّت ایک سیلاب کی سی ہے اور ظاہر ہے کہ سیلاب کا مقابلہ جمُود کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اِس کے لیے ایک والہانہ جذبے کی ضرورت ہے جو جوابی سیلاب کی صورت اختیار کر لے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎ :

عشق خود اِک سَیل ہے سَیل کو لیتا ہے تھام

اور الحمدللہ کہ ہمیں اِس کے لیے ہرگز نہ کسی تکلّف یا تصنّع کی ضرورت ہے نہ کسی جدید نظریے اور نظام کے دَر پر مرعُوبانہ اور مقلّدانہ درِیُوزہ گری کی احتیاج اِس لیے کہ: اوّلاً اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے ہے ہی ایک 'انقلابی تحریک' اور یہ اِس بنا پر کہ اسلام صرف 'مذہب' نہیں کامل 'دین' ہے جو صرف عقائد و عبادات اور چند معاشرتی و سماجی رسومات سے عبارت نہیں ہے بلکہ ان سب پر مستزاد ایک کامل و اکمل، متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام پر مشتمل ہے اور از رُوئے قرآنِ حکیم بعثتِ محمّدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا مقصد ہی اِس نظامِ حق کا پُورے نظامِ زندگی پر غلبہ ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ"[۱] یعنی "وہی ہے اللہ، جس نے بھیجا اپنے رسُول (محمدؐ) کو الہُدیٰ (قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر" اور اسی مقصد

---

[۱] (سورۃ توبہ آیت ۳۳، سورۃ فتح آیت ۲۸، اور سورۃ صف آیت ۹)

کے حصول و تکمیل کے لیے جدّوجہد اور اس کے ضمن میں بذلِ نفس اور انفاقِ مال کی پُرزور دعوت دیتا ہے قرآنِ حکیم ایمان کے تمام دعویداروں کو "جہاد فی سبیل اللہ" کی فرضیت کے عنوان سے بعنوانِ الفاظِ قرآنی "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ط

(ترجمہ) "اے اہلِ ایمان کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ" (سورۂ صف آیات ۱۰/۱۱) اور اِس جہاد فی سبیل اللہ کو شرطِ لازم اور رُکنِ رکین قرار دیتا ہے ایمانِ حقیقی کا سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۵ کی رُو سے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ط أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ٥ (ترجمہ) "مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر، پھر ہرگز شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور جہاد کیا انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ، صرف یہی لوگ (دعویٔ ایمان میں) سچّے ہیں" ——— گویا ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی ‏ ‏ ‏ میں اِسی لیے مسلماں، میں اِسی لیے نمازی

کے مصداق پورے نظامِ زندگی پر اللہ کے عطا کردہ کامل سماجی و معاشی و سیاسی نظام ——— (SOCIO-POLITICO-ECONOMIC SYSTEM) ——— کا غلبہ ہر بندۂ مومن کی زندگی کا اصل مقصد اور اُس 'جہادِ زندگانی' کا اصل ہدف ہے جس کے لوازم و شرائط اور اوزار و ہتھیار ہیں: ایمان و یقین کی دولت، پیہم سعی و جہد کا مادّہ اور محبّت اور اخوّت کی قوّتِ تسخیر بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبّت فاتحِ عالم ‏ ‏ ‏ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ثانیاً: ہم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان قائم ہی دین کے اِس حرکی تصوّر (DYNAMIC CONCEPT) پر ہوا تھا۔ چنانچہ ایک جانب پاکستان کے بانی و مؤسّس قائدِ اعظم محمّد علی جناح مرحوم نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا تھا کہ "ہم پاکستان اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اِس کے ذریعے عہدِ حاضر میں اسلام کے ابدی اور زرّیں اصولِ حرّیت و اخوّت و مساواتِ انسانی (HUMAN FREEDOM, FRATERNITY AND EQUALITY) کا عملی نمونہ پیش کریں۔" (روایت

بالمعنیٰ) اور ایک موقع پر پاکستان کے دستور کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "ہمارا دستور آج سے چودہ سو سال قبل قرآن کی شکل میں مدون ہو گیا تھا!" (روایت بالمعنیٰ) اور دوسری جانب مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام کی الہامی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی ابلیسی قوتوں کو لاحق ہونے والے سب سے بڑے خطرے اور اندیشے کی نشاندہی کی تھی یعنی ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

تو اس کے ضمن میں علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ اسلام کے پورے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے بنیادی اصولوں کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں بیان کر دیا تھا بلکہ در اصل تحریکِ پاکستان کا پورا 'منشور' (MANIFESTO) پیش کر دیا تھا ؎

الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر!
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!!

نہ صرف یہ بلکہ علامہ اقبال نے تو خاص طور پر موجودہ ظالمانہ اور استحصالی معاشی نظام کے استیصال اور بیخ کنی کے لیے باضابطہ 'انقلاب' کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب ـــــ اے ـــــ انقلاب

اِس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ یا اندیشہ لاحق نہ ہو کہ اگر سرمایہ داری اور زمینداری کے خلاف انقلابی نعرہ لگایا گیا تو یہ اسلام کی بجائے کسی اور 'ازم' کی جانب رجُوع و التفات ہو گا اِس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ شخصی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اِن دونوں کی جڑیں جس طرح اسلام کاٹتا ہے اور کوئی نظام نہیں کاٹ سکتا۔ چنانچہ 'رِبوا' کی قطعی اور مؤکّد ترین حُرمت کے ذریعے 'سرمایہ داری' کی بیخ کنی ہو جاتی ہے 'اگرچہ 'سرمایہ کاری' کے لیے صحت مند فضا' یہاں تک کہ اُس کے ضمن میں مقابلہ و مسابقت تک کا میدان برقرار رہتا ہے۔ اِسی طرح خواہ امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ اور امامِ دار الہجرت امام مالکؒ کے متفقہ فتویٰ کو اختیار کر لیا جائے کہ مزارعت (ABSENTEE LANDLORDISM) کی ہر صورت حرامِ مطلق ہے خواہ فقہِ حنفی کے اِس فتوے پر عمل کر لیا جائے کہ مفتوحہ ممالک کی اراضی کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہیں دونوں صورتوں میں جاگیرداری اور مروجہ زمینداری کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ (اپنے حالیہ سفرِ ابوظہبی کے موقع پر ایک اہم اور قابلِ اعتماد شخصیت کے ذریعے معلوم ہُوا کہ مُلکِ شام کے بعثی انقلاب سے پہلے کے دَور کے ایک صدر نے جو آجکل ابوظہبی میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اُنہیں یہ بتایا کہ شام میں ۱۹۴۵ء تک سابقہ خلافتِ عثمانیہ ہی کا بندوبستِ اراضی چل رہا تھا اور اُس کی رُو سے کُل اراضی بیت المال کی ملکیت تھیں۔ آئندہ وہاں جانا ہُوا تو اِن شاءاللہ اُن صاحب سے خود ملاقات کر کے توثیق حاصل کروں گا۔)

الغرض پاکستان کے بقاو دوام اور اُس کی ترقی و استحکام کی واحد ممکنہ اساس وہ مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جو قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی و عملی اسلام اور اُس کی بھی کسی متجدّدانہ اور دانشورانہ تعبیر نہیں بلکہ علماءِ کرام کے مصدّقہ تصوّرات پر مبنی ہو اور نِری جامد مذہبیت نہیں بلکہ ایک متحرک انقلابیت کی صوُرت اختیار کرے!!

اور یہ چیز خود اسلام کے اعتبار سے بھی 'تجدّد' نہیں بلکہ صرف 'تجدید' کا مظہر ہو گی اور پاکستان کے نقطۂ نگاہ سے بھی کسی نئی منزل کی جانب رُخ موڑنے کی نہیں بلکہ ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو" کے مصداق اپنے تاسیسی نظریہ و مقصد کی جانب رجُوع کے مترادف ہو گی۔ (اِنشاءاللہ)

موجودہ مسلمان معاشرے کا اِسلام کے ساتھ عملی تعلّق

گزشتہ مباحث سے یہ حقیقت بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ :

(۱) پاکستان کی اصل اساس صرف اور صرف اسلام ہے۔

(۲) اس کا دوام و استحکام صرف ایک ایسے جاندار مذہبی جذبے کے ذریعہ ممکن ہے جو عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ حقیقی و عملی تعلق کی بنیاد پر اُبھرے اور ایک انقلابی تحریک کی صورت اختیار کرے

تو آیئے اب ذرا اِس امر کا جائزہ لیں کہ مجموعی اعتبار سے ہمارے موجودہ معاشرے کے اسلام کے ساتھ حقیقی لگاؤ اور عملی تعلق کا کیا حال ہے ؟ اور ہمارے قومی اور ملّی وجود کی اِس واحد اساس کے ساتھ ہمارا بالفعل تعلق کس درجہ کا ہے ؟

ایک ضروری وضاحت

اِس مرحلہ پر ایک اہم وضاحت بہت ضروری ہے ———— ہمارے سابقہ مباحث سے بھی کچھ لوگوں نے لازماً مایوسی اور بد دِلی کا تأثر قبول کیا ہو گا اور اس کا اندیشہ ہے کہ پیشِ نظر جائزے اور تجزیے سے اِس کیفیت میں مزید شدت پیدا ہو جائے، لہٰذا مناسب ہے کہ یہاں یہ ذکر کر دیا جائے کہ جس تصویر کا تاریک رُخ مسلسل سامنے آ رہا ہے اُس کا ایک نہایت روشن اور تابناک رُخ بھی ہے جو اِن شاء اللہ ذرا اور آگے چل کر سامنے آئے گا ———— سرِدست جس ترتیب سے بحث آگے بڑھ رہی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ ہم ناخوشگوار حقائق کو اُن کی واقعی صورت میں دیکھنے کی ہمت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مشاہدے اور جائزے و تجزیے کو امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ معروضی (OBJECTIVE) رکھیں

تاکہ ہمارے سامنے مسئلہ کی نزاکت اور صورتِ حال کی سنگینی پوری طرح واضح ہو اور ہم اُس کے تدارک کے ضمن میں نہ سطحی انداز اختیار کریں نہ محض دفع الوقتی کی تدابیر میں اُلجھ کر رہ جائیں بلکہ پوری سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور فیصلہ کُن انداز میں بھرپور اقدامات کا فیصلہ کر سکیں۔

پندرہ سال قبل اور آج

اتفاق کی بات ہے کہ راقم اپنے پیشِ نظر سلسلۂ مضامین کے ضمن میں جب اُس مقام پر پہنچا تو اچانک ذہن منتقل ہُوا کہ اسی موضوع پر راقم نے آج سے لگ بھگ پندرہ سال قبل پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کی لاہور برانچ کی ایک تقریب میں تقریر کے دوران اپنا جائزہ اور تجزیہ ایک تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ تقریر کا وہ حصّہ ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اس موقعے پر اُس پر نظر ڈالنے سے ایک تو یہ احساس ہُوا کہ اِس تمثیل کے ذریعے ہمارے معاشرے کی اسلام کے ساتھ عملی تعلق کی نہایت صحیح تصویر پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے اور دوسرے یہ حیرتناک اور افسوسناک انکشاف بھی ہُوا کہ اِس کے باوجود کہ ہمارے معاشرہ میں متعدد دینی جماعتیں اور تحریکیں اپنے اپنے انداز میں کام کر رہی ہیں اور ہماری آبادی کے طبقۂ متوسط (MIDDLE CLASS) کا خاصا قابلِ لحاظ حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے تاہم پندرہ سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود بحیثیتِ مجموعی ہمارے موجودہ مسلمان معاشرہ کے اسلام کے ساتھ عملی تعلق میں نہ نوعیت و کیفیت کے اعتبار سے (QUALITATIVELY) کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے نہ ہی تناسب اور کمیّت کے اعتبار سے (QUANTITATIVELY) کوئی فرق پیدا ہوا ہے۔ اِس لیے کہ جہاں ہماری قوم کے درمیانی طبقے میں مختلف ذہنی و مذہبی تحریکوں کے زیرِ اثر دین و مذہب کے ساتھ عملی لگاؤ کے تناسب میں کسی قدر اضافہ ہوا ہے وہاں عوام کے طبقۂ زیریں (LOWER CLASS) میں اُس کیفیت کے بالکل برعکس جو علامہ اقبال نے اب سے پون صدی قبل اِس شعر میں بیان کی تھی کہ ؎

آ کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
پردہ رکھتے ہیں اگر کوئی تمہارا تو غریب

نہ صرف یہ کہ دین و مذہب کے ساتھ عملی لگاؤ میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے، بلکہ لادینی طرزِ فکر (SECULAR THINKING) اور مادہ پرستانہ اقدار (MATERIALISTIC VALUES) کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملحدانہ افکار و نظریات اور اس مادہ پرستانہ طرزِ عمل کے اثرات جو پہلے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات (EDUCATED ELITE) تک محدود تھے، گزشتہ پندرہ سالوں میں اولاً ٹرانسسٹر اور بعد ازاں ٹیلی ویژن ایسے مؤثر اور طاقتور ذرائع ابلاغ (MEDIA) کے ذریعے ہمارے معاشرہ کی سب سے تحتانی سطح یعنی (GRASS ROOT LEVEL) تک پہنچ گئے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ طبقۂ متوسط میں دین و مذہب کا اثر و نفوذ غیر مؤثر (NEUTRALISE) ہو گیا ہے۔ بلکہ نسبت و تناسب کے پلڑے کا جھکاؤ مزید فیصلہ کن انداز میں لادینیت کی جانب ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم!!

چار ہم مرکز دائرے

بہرحال، راقم کے مشاہدے کے مطابق دین و مذہب کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ اور عملی تعلق کے اعتبار سے پاکستان کا موجودہ مسلمان معاشرہ چار ایسے ہم مرکز دائروں (CONCENTRIC CIRCLES) پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے نمایاں طور پر ممتاز (DISTINCT) ہیں۔ چنانچہ ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ مرکز سے بالکل متصل ہے جس میں میرے اندازے کے مطابق ہماری کُل آبادی کا بمشکل ایک فی صد بلکہ اس سے بھی بہت کم شامل ہے ـــــ اس کے باہر ایک ذرا بڑا دائرہ ہے جس میں کُل آبادی کے دو یا زیادہ سے زیادہ تین فی صد لوگ شمار کیے جا سکتے ہیں ـــــ پھر ایک اور بڑا دائرہ ہے جس میں لگ بھگ پانچ چھ فی صد لوگ شامل ہوں گے ـــــ اور پھر ایک بہت بڑا دائرہ ہے جو بقیہ نوّے بانوے فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔

ہماری ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہیں ہے

ان میں سب سے بڑا دائرہ جس کی خارجی حدود پورے معاشرے کو محیط ہیں، اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا۔ ماسوائے اُن چند ناگزیر

تمدنی اور سماجی امور کہ جن میں دین ومذہب کے خلاف کسی روش کا اختیار کرنا مذہب سے علی الاعلان قطع تعلق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا یعنی شادی بیاہ کا معاملہ، میت کی تکفین وتدفین سے متعلق رسومات اور کچھ مذہبی تہوار وغیرہ۔

اِس سلسلے میں، مَیں جب زور دے کر کہتا ہوں کہ ہماری عظیم اکثریت کا مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو اُس سے میرے احساس کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور مَیں ہر شخص کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ دین ومذہب کے ساتھ عملی تعلق کا چاہے کوئی معیار (CRITERION) متعین کرلے، جب وہ اِس پر اپنے موجودہ معاشرے کو پرکھے گا تو اُس کے سامنے بعینہٖ وہی نتیجہ آئے گا جو اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثریت کا اِس کے سوا کہ جب اِن کے یہاں شادی ہوتی ہے تو پھیرے نہیں پڑتے بلکہ کوئی مولوی صاحب نکاح ہی کی رسم ادا کرتے ہیں ——— یا کوئی مرجاتا ہے تو اُسے جلایا نہیں جاتا بہرحال نمازِ جنازہ ہی ادا کی جاتی ہے اور تکفین وتدفین ہی کا معاملہ ہوتا ہے ——— یا یہ کہ ہولی یا دیوالی یا کرسمس نہیں منائے جاتے، عید وبقرعید ہی کے تہوار منائے جاتے ہیں، دین ومذہب کے ساتھ کوئی اور عملی تعلق موجود نہیں ہے ——— اسلام کے اوامر ونواہی کی مفصل فہرست اور حلال وحرام کا تفصیلی خاکہ تو دُور کی بات ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ پنجگانہ کو کفر اور اسلام کے مابین حدِ فاصل قرار دیا ہے، خواہ اِس معیار کو سامنے رکھ لیا جائے یا اِس سے بھی آگے بڑھ کر بلا عذرِ شرعی مسلسل تین جمعوں کی غیر حاضری پر تو صاف وعید سنادی گئی ہے کہ اللہ کو ایسے شخص کے بارے میں کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ نصرانی ہوکر مرے یا یہودی ہوکر، تو خواہ اِس پیمانے سے ناپ لیا جائے بہرحال آپ جس پیمانے سے بھی ناپیں گے نتیجہ ایک ہی نکلے گا اور وہ یہ کہ ہماری قوم کی ایک عظیم اکثریت کا دین ومذہب سے کوئی واقعی اور عملی تعلق موجود نہیں ہے۔

پھر ایسا نہیں ہے کہ یہ صورتِ حال معاشرے کے کسی خاص طبقہ کی ہو ——— ایک عام مغالطہ پیدا ہوگیا ہے یا پیدا کردیا گیا ہے کہ یہ معاملہ صرف اُمراء یا اعلیٰ طبقہ کا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حال ہماری پوری سوسائٹی کا بحیثیتِ مجموعی ہے۔ چنانچہ اُمراء کی اکثریت بھی اِسی حال میں ہے اور غربا کی بھی۔ کارخانہ داروں کی اکثریت کا حال بھی یہی ہے اور مزدوروں کا بھی۔ زمینداروں کی

اکثریت بھی دین سے اتنی ہی دُور ہے اور کاشتکاروں کی بھی۔ گلبرگ اور کلفٹن کے باسی بھی اکثر و بیشتر اسی حال میں ہیں اور جھونپڑیوں کے مکین بھی ——— الغرض ہماری پوری سوسائٹی کا چاہے جس زاویہ سے CROSS SECTION لے لیا جائے، صورتِ معاملہ واحد ہے۔ صرف اِس ایک فرق کے ساتھ کہ اُمراء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے ایک مُعتد بہ اور غالب حصّے میں اِس عملی رَوِش کی پُشت پر ایک فکری اِلحاد اور ذہنی اِرتداد بھی موجود ہے۔ جبکہ عوامُ النّاس کے اذہان میں کوئی واضح چیز موجود نہیں۔ وہ صرف ایک رَو میں بہے چلے جا رہے ہیں جو اکثر و بیشتر انہی اعلیٰ طبقات کے زیرِ اثر چل رہی ہے ——— الغرض یہ ہے ہماری قوم کی غالب اکثریت کا حال!

مذہب کے متوسلین کی اکثریت کا تصوّرِ دین محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!!

اِس بڑے دائرے کے اندر ایک نسبتاً چھوٹا دائرہ ہے جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دین و مذہب سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں ——— چنانچہ انہی کے دَم سے مساجد تعمیر ہوتی ہیں اور آباد رہتی ہیں۔ مدارس و مکاتب اور دار العلوم قائم ہوتے ہیں، اور جاری رہتے ہیں۔ جمعہ و جماعت کا نظام قائم ہے۔ ماہِ صیام کی رونق اور گہما گہمی ہے۔ حج اور عُمرہ کے لیے آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے ——— الغرض مذہب کا پُورا ڈھانچہ قائم ہے۔

لیکن ذرا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس طبقے کی ایک عظیم اکثریت کا تصوّرِ دین نہ صرف یہ کہ نہایت محدود (LIMITED) ہے بلکہ اکثر و بیشتر حالتوں میں سخت مسخ شدہ (PERVERTED) بھی ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک مذہب صرف بعض علامات (SYMBOLS) اور رسُومات (RITUALS) کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اُس کا کوئی تعلق نہ اِنسان کی اِنفرادی سیرت و کردار سے رہ گیا ہے نہ قومی و مِلّی امُور اور اجتماعی معاملات سے۔ نتیجۃً وہ دین جو اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے پوری انسانی زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے اُن کے یہاں زندگی کے بہت ہی چھوٹے سے گوشے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے وسیع تر تقاضوں کا انہیں سرے سے کوئی احساس ہی نہیں! یہی وجہ ہے کہ اِس حلقے کی ایک غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ دینداری کے جملہ مظاہر

یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج حتیٰ کہ پوری شرعی وضع قطع کے ساتھ ساتھ بلیک مارکیٹنگ بھی چلتی ہے اور ذخیرہ اندوزی بھی، اسمگلنگ بھی جاری رہتی ہے اور کرنسی کا غیر قانونی لین دین بھی ——— اشیاء خورد و نوش ہی نہیں ادویات تک ان میں سے بعض کے ہاتھوں ملاوٹ ایسی حد درجہ مکروہ حرکت سے محفوظ نہیں رہتیں۔ انکم ٹیکس، کسٹم اور ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ سرکاری محصولات کی چوری کو مباح کا مقام دینے میں انہیں ذرا باک نہیں۔ رشوت دی بھی جاتی ہے اور لی بھی ——— سُودی رقوم سے کاروبار کو وسیع تر کرنا اور مکان تعمیر کرنا تو شیرِ مادر ہے ہی، جہاں موقع ملے سٹے وغیرہ سے بھی اجتناب نہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اِلّا ماشاء اللہ اِس حلقے کی اکثریت ذاتی اخلاق اور بین الانسانی معاملات کے دائرے میں بالعموم بہت پستی کردار کا مظاہرہ کرتی ہے۔ خشونت، درشتی اور سنگ دلی بالعموم ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں اور ہمدردی اور دل کی نرمی سے انہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں اِلّا ماشاء اللہ۔ اِن تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل اِن لوگوں سے متنفّر ہو کر سرے سے دین و مذہب ہی سے بدظن ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تصوّرِ مذہب کی اِسی محدودیت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہب کے نام پر نت نئی رسومات ایجاد ہو رہی ہیں اور بدعات و رسومات کا بازار ہے کہ گرم سے گرم تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسلام جو انتہائی سادہ دینِ فطرت ہے، روز بروز اوہام کے پلندے اور بدعات و رسومات کے طومار کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے ——— اس کی وجہ بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ وہ دینی و مذہبی جذبہ جسے انسان کی پوری زندگی میں سرایت کر جانا چاہیے تھا، جب سمٹ کر صرف ایک گوشے میں مقید ہو گیا اور اُسے اپنی تسکین صرف اِسی چھوٹے سے گوشہ ہی سے حاصل کرنی پڑی تو اس نے زور لگا کر اسی گوشہ میں غیر متناسب طور پر (OUT OF PROPORTION) بڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک طرف میّت کی رسومات کا سلسلہ ہے کہ ربڑ کی طرح کھنچتا چلا جا رہا ہے اور دوسری طرف تہواروں کا معاملہ ہے کہ ان کی فہرست بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وقِس علیٰ ہٰذا۔

مختصر یہ کہ دین و مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی ایک غالب اکثریت کا تصوّرِ مذہب نہایت محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

وسیع تر تصوّر کے حامل لوگوں کی اکثریت خود کچھ کرنے کو تیّار نہیں !!

اِس دوسرے دائرے کے اندر ایک تیسرا چھوٹا دائرہ ہے جو اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تصوّرِ دین و مذہب خاصا وسیع ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اسلام صرف چند عقائد اور رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد کائنات، انسان اور حیاتِ انسانی کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر پر قائم ہے اور وہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطہ میں لینا چاہتا ہے اور حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں پر تسلّط اور حکمرانی کا طالب ہے۔ برِّصغیر میں یہ فکر ماضیٔ قریب میں اولاً علاّمہ اقبال مرحوم کے اشعار سے پروان چڑھا اور اُن کے بعد مولانا مودودی مرحوم اور بعض دوسرے اصحابِ علم کی تحریروں نے اِسے مزید واضح بھی کیا اور زیادہ بڑے حلقہ میں عام بھی کیا۔ چنانچہ اب یہ ایک واقعہ ہے کہ برِّصغیر کے مسلمانوں کی موجودہ نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ اِس فکر سے متاثر ہے اور اُس کے دِل میں احیائے اسلام کی آرزو اور اقامتِ دین کی تمنّا بھی موجود ہے ——— اور اسلام کی عظمتِ گذشتہ اور مسلمانوں کی سطوتِ پارینہ کی بازیافت کی خواہش بھی ——— لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اِس طبقہ کی ایک بڑی اکثریت محض حسین تمنّاؤں اور خوشنما آرزوؤں کے سہارے جی رہی ہے خود کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اِن کی خواہش غالباً یہ ہے کہ یہ سارے کام کوئی اور کر دے اور وہ خود اپنی اپنی دلچسپیوں اور پیشہ ورانہ مصروفیتوں میں مگن رہیں، خود اُنہیں نہ کوئی ایثار کرنا پڑے نہ قربانی دینی پڑے، نہ کوئی تکلیف برداشت کرنی ہو اور نہ کسی محنت و مشقّت کا سامنا ہو۔ وہ بہت زور لگائیں گے تو کسی جماعت کے لیے تائید و تحسین کے چند جملے زبان سے ادا کر دیں گے یا اُسے کوئی مالی امداد بھم پہنچا دیں گے اور وہ بھی اپنی آمدنیوں کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر۔ اللہ اللہ خیر سلاّ ——— اِس سے آگے بڑھ کر نہ اُن کی زندگیوں کا رُخ تبدیل ہوگا نہ دلچسپیوں میں کمی آئے گی اور نہ ہی شب و روز کے مشاغل میں کوئی فرق واقع ہوگا۔

الغرض ——— یہ ہے میرے تجزیہ کے مطابق ہماری موجودہ سوسائٹی کا دائرۂ ثالث جو دین و مذہب کے لیے زبانی جمع خرچ (LIP SERVICE) میں تو بہت آگے ہے لیکن اِس کے لیے

کسی عملی جدوجہد میں شرکت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں۔ حالانکہ میرے نزدیک اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا کٹھن مرحلہ اگر سر ہوسکتا ہے تو اسی حلقہ کی محنت و مشقت اور ایثار و قربانی سے ——— اور اگر اس طبقہ کو آمادۂ عمل (ACTIVATE) نہ کیا جا سکا تو میرے نزدیک اس منزل کی طرف قدم اٹھانا بہت مشکل ہے، اس لیے کہ اگرچہ یہ دائرہ پہلے دونوں دائروں سے تو بہت چھوٹا ہے لیکن ہے نہایت اہم!

فعّال دینی جماعتیں اور جمعیتیں

اِن تینوں دائروں کے اندر ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ ہے جسے ہم مذہب کیلئے سرگرمِ کار لوگوں کا حلقہ کہہ سکتے ہیں (RELIGIOUS ACTIVISTS) جس میں ہماری کُل آبادی کی بمشکل ایک فی صد بلکہ اُس سے بھی بہت کم تعداد شامل ہے۔ یہ حلقہ بہت سی خالص مذہبی یا نیم دینی و نیم سیاسی جماعتوں پر مشتمل ہے۔ جن کی جڑیں دوسرے اور تیسرے دائروں میں دُور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جن سے انہیں اخلاقی تائید اور مالی تعاون کی صورت میں غذائیت حاصل ہوتی رہتی ہے ——— اِن میں سے دو تو "جماعتیں" ہیں اور کم و بیش نصف درجن "جمعیتیں" ——— جماعتوں میں ایک تبلیغی جماعت ہے جو خالص مذہبی اور بالکل غیر سیاسی خطوط پر کام کر رہی ہے اور دوسری جماعتِ اسلامی ہے جو اس کے برعکس سیاست کے میدان میں بہت آگے نکل گئی ہے اور اس خارزار میں کچھ زیادہ ہی اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اس بُعد المشرقین کے ساتھ ساتھ ان میں دو باتیں مشترک بھی ہیں۔ ایک یہ کہ ان دونوں کی تاریخ تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ان دونوں کو اصل تائید و تقویت دائرۂ ثالث سے مل رہی ہے اور ان کی جڑیں زیادہ تر اسی حلقہ میں قائم ہیں ——— ان کے بالمقابل اہلحدیث، دیوبندی اور بریلوی علماء پر مشتمل "جمعیتیں" ہیں جن کی مزید تقسیم اور تسمیہ کا سلسلہ کچھ ایسا پیچ در پیچ ہے کہ عام آدمی کی سمجھ میں آنے والا نہیں، بہرحال ان میں بھی دو امور مشترک ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک اپنی پُشت پر لگ بھگ پوری صدی کی تاریخ رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی اصل جڑیں دائرۂ دوم میں قائم ہیں اور وہیں سے ان کے تغذیہ و تقویت کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

مذہب کی نام لیوا، بلکہ علمبردار جماعتوں اور جمعیتوں کے بارے میں سب سے زیادہ نمایاں المیہ ان کا باہمی اختلاف بلکہ مخالفت ہے جو حد درجہ مکروہ الزام تراشی بلکہ دشنام طرازی کی حد تک پہنچ جاتی ہے

اور اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب ان سب کے مجموعی اثرات بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں تاہم جس مایوس کن شکست کا سامنا مذہب کے نام لیواؤں کو ملک کے عام انتخابات میں کرنا پڑتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس میں بہت حد تک دخل اِس باہمی تفرقہ بازی اور سر پھٹول کو حاصل ہے چنانچہ ہمارے معاشرے کے اُن طبقات کو جو دین و مذہب کے مستقبل سے کسی قدر دلچسپی رکھتے ہیں۔ اِس صورتِ حال سے فی الواقع بہت صدمہ پہنچتا ہے، جس کی ٹیسیں اکثر لوگوں کو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی رہتی ہیں اور ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے دِلوں میں یہ حسرت بھری تمنا موجود ہے کہ کسی طرح مختلف فرقوں اور گروہوں کے عُلماء و زُعماء اور مختلف مذہبی جماعتیں متحد ہو کر کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں یا کم از کم یہ جماعتیں اور جمعیتیں اپنے اپنے طریقہ ہائے کار میں اعتدال کی روش اختیار کر لیں۔ چنانچہ اس ذیل میں بہت سے لوگ انہیں مخلصانہ مشوروں سے نوازتے بھی رہتے ہیں۔

میری حقیر رائے میں اِن نیک تمناؤں کا بر آنا آسان نہیں ہے۔ اِس لیے کہ نہ یہ جماعتیں اور جمعیتیں کوئی آج قائم ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کے طریقہ ہائے کار اتنے حادث ہیں بلکہ جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اُن کی پُشت پر پوری پوری صدی یا کم از کم نصف صدی کی تاریخ ہے اور اِس طویل عرصہ کے دوران میں ان کے مخصوص نقطہ ہائے نظر، طریق ہائے کار اور مزاج و اُفتادِ طبع پختہ ہوتے چلے گئے ہیں ــــــ اور اب اِن میں کسر و انکسار اور ترمیم و تغیر ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہے تاہم ملک و ملت کے خیر خواہوں کو اِس کے ضمن میں پوری ہمت و عزیمت کو بروئے کار لانا چاہیے۔ اِس لیے کہ کسی بھی مؤثر اور نتیجہ خیز تعمیری کوشش کے آغاز کے لیے اِس کٹھن منزل کا سر کرنا ناگزیر ہے!

حاصلِ کلام: عقدۂ لاینحل؟

اب تک کی کُل بحث کے نتیجے میں ہم بظاہر ایک نہایت شدید قسم کی منطقی پیچیدگی یا عقدۂ لاینحل (DILEMMA) سے دوچار ہو گئے ہیں یعنی ہمارے تجزیے کے مطابق ایک جانب پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی واحد اساس اسلام ہے اور اس کے بقاء و استحکام کا واحد ذریعہ صرف ایک ایسا زوردار اور متحرک مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جس کی جڑیں عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی تعلق میں گہری اُتری ہوئی ہوں اور دوسری جانب بحیثیتِ مجموعی پاکستان کے موجودہ مسلم معاشرے کا دین و مذہب کے ساتھ

حقیقی و عملی تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اِس پر فطری طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ع "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما" لیکن اِس سے قبل کہ ہم اُس عملی تدبیر پر غور کریں، ہمارے قومی و ملّی وجُود کی تصویر کا دُوسرا رُخ جو نہایت روشن اور تابناک ہے سامنے آجانا چاہیے۔ لہٰذا آئندہ اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔

تصویر کا روشن رُخ

باب ششم — پاکستان کا معجزانہ قیام

باب ہفتم — قائدِ اعظم مرحوم کی غیر معمولی شخصیت

بات ہشتم — نصرت وحفاظتِ خداوندی

پاکستان کا معجزانہ قیام

ہمارے قومی اور ملّی وجود کی تصویر کا روشن اور تابناک رُخ بالکلیہ ارادہ و مشیّتِ ایزدی اور تائید و نصرتِ الٰہی کا مظہر ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان کا عالمِ وجود میں ظہور بھی ایک خالص معجزہ کی حیثیت سے ہُوا تھا اور اُس کا اب تک قائم رہنا بھی 'معجزات' ہی کے تسلسل کا مرہونِ منّت ہے۔

یہ امور اگرچہ اصلاً ع "رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں!" کے ذیل میں آتے ہیں اور اِس قبیل کے اِکّا دُکّا واقعات کو تو پہچاننا بھی صرف اُن لوگوں کا کام ہے جن کا باطن منوّر ہو اور جو ع "گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!" کی کیفیت کے ضمن میں رُسوخِ تام حاصل کر چکے ہوں ـــــ تاہم جب اِن "معجزات" کا تسلسل ہو اور خارقِ عادت واقعات پے در پے ظہور پذیر ہو رہے ہوں تو ایک عامی انسان بھی ان کا ادراک کر سکتا ہے، بشرطیکہ اُسے ایک ایسے قادرِ مطلق اور فاعلِ حقیقی خدا پر کسی درجے میں ایمان حاصل ہو جو اس کائنات کا خالق، باری اور مصوّر ہی نہیں، مالک، حاکم اور مدبّر بھی ہے۔ چنانچہ کُل سلسلۂ اسباب وعلل اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور نتائج و عواقب کا ظہور بالکلیہ اُسی کے اِذن و مشیت کے تابع ہے، یہاں تک کہ ایک پتّہ بھی اُس کے علم و اِذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا اور ایک حدیثِ نبویؐ کے مطابق "تمام انسانوں کے دل اس کی دو انگلیوں کے مابین ہیں، انھیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے۔"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام و بقا کے ضمن میں 'معجزانہ' نوعیت کے واقعات کا ظہور اِس تسلسل کے ساتھ ہُوا ہے کہ کوئی بالکل ہی کور باطن ہو تو اَور بات ہے،

ورنہ ہر صاحبِ دیدۂ بینا کو صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان کا قیام ارادہ و مشیتِ خداوندی کے ایک خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا وجود یقیناً تدبیرِ الٰہی کے کسی طویل المیعاد منصوبے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے معجزات اور خارقِ عادت واقعات کے بارے میں بعض اہم اُمور کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

اوّلاً یہ کہ اُن مخلوقات کے ضمن میں جو نہ صاحبِ ارادہ و شعور ہوں، نہ سزاوارِ جزا و سزا، معجزات طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو علانیہ توڑ اور پھاڑ کر ظاہر ہوتے رہے ہیں ـــــ جیسے کبھی ایک چٹان سے حاملہ اُونٹنی برآمد ہو گئی، کبھی آگ ابراہیمؑ کے لیے گُل و گلزار بن گئی، کبھی موسیٰؑ کے عصا نے زندہ و متحرک اژدہے کی صورت اختیار کر لی اور کبھی اُس کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹ گیا وغیر ذالک!

لیکن انسان چونکہ ایک مکلف اور مستحق جزا و سزا وجود کا حامل ہے جس کے لیے ارادہ و اختیار کی آزادی لازمی و لابدی ہے، لہٰذا انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی ارادہ و مشیت کا ظہور کبھی اِس طور سے نہیں ہوتا کہ انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی سلب ہو جائے بلکہ قدرت و حکمتِ خداوندی کا کمال یہ ہے کہ اردہ و اختیار کی جیسی اور جتنی کچھ آزادی انسانوں کو عطا ہوئی ہے وُہ بھی برقرار رہتی ہے اور اس کے باوصف تدبیرِ امر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی تصرف بھی بروئے کار آتا رہتا ہے اور اس طرح قدرت کے ارادے اور منصوبے تکمیل کو پہنچتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کسی دشمن کی لات کسی کبڑے کے لیے جسمانی عیب کے ازالے کا سبب بن جاتی ہے اور کبھی برادرانِ یوسفؑ کا یوسفؑ کو حسد سے مغلوب ہو کر چاہِ کنعان میں پھینک دینا، "تدبیر کُند بندہ تقدیر زند خندہ" کے مصداق یوسفؑ کے دینوی عروج کا زینہ اور تمکن فی الارض کا ذریعہ بن جاتا ہے، وقِس علیٰ ذالک ـــ!

دوسری اہم حقیقت جو پیشِ نظر رہنی چاہیے یہ ہے کہ جبکہ انسان ہر حال میں اللہ تعالےٰ کے قانونِ تشریعی کا پابند ہے جس کے ضمن میں مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم تو بہت ہی اہم ہے کہ اسی پر اسلامی تمدن و معاشرت کے پورے نظام کی اساس اور اسلامی ریاست و حکومت کے پورے ڈھانچے

کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اِسی طرح محسن و متقی اور فاسق و فاجر کا فرق بھی بہت اہم ہے جو اُخروی انجام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن اُمورِ تکوینیہ کے ضمن میں قدرتِ خداوندی ان حُدود و قیود کی پابند نہیں ہے بلکہ اِن سے بالکلیہ آزاد اور بلند و بالا سطح پر تدبیر امر کرتی ہے ـــــــ چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اِرادۂ خداوندی کسی قانونی وفقہی اِعتبار سے مسلمان لیکن اعمال و اخلاق کے اِعتبار سے فاسق و فاجر قوم کی تنبیہہ اور سرزنش کے لیے حرکت میں آتا ہے تو کوئی کافر و منکر اور باغی و مشرک قوم "دستِ قضا" میں شمشیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جیسے سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ضمن میں کبھی بخت نصر اور ٹائیٹس رُومی اور موجودہ اُمتِ مسلمہ کے لیے کبھی چنگیز و ہلاکو اور کبھی ہنود و یہود! ـــــــ اِسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرتِ خداوندی کسی مسلمان قوم کی فلاح و بہبود حتّٰی کہ اپنے دین کی حفاظت و مدافعت کے لیے کسی عامی و عاصی مسلمان سے کوئی خدمت لے لیتی ہے، جیسے حدیثِ نبویؐ میں وارد ہُوا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ" (صحیح مسلم: کتاب الایمان؛ ترجمہ" اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت و نصرت فاسق و فاجر انسان کے ذریعے بھی کرتا ہے") جس کی نمایاں ترین مثال بھٹو صاحب کے ہاتھوں قادیانیوں کا غیر مسلم قرار دیا جانا ہے ـ! بلکہ اِس سے بھی آگے بڑھ کر قدرتِ خداوندی کبھی اسلام کی کوئی جُزوی خدمت کسی غیر مسلم یا انتہائی بر خود غلط اور حد درجہ ضال اور مُضِل انسان سے بھی لے لیتی ہے، جیسے برصغیر پاک و ہند میں انگریزی دَور کے آغاز میں اسلام پر عیسائی پادریوں کی جارحانہ پیش قدمی کی روک تھام کے ضمن میں راجہ رام موہن رائے کی تالیف "تحفۃ الموحدین" اور بعد میں آریہ سماجیوں کے حملے سے مدافعت کے ضمن میں آنجہانی غلام احمد قادیانی کی تصنیف "سُرمہ چشم آریہ" ـــــــ!

یہ حقیقت کہ پاکستان کا قیام ایک "معجزہ" تھا پورے طور پر تو اُسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب برصغیر پاک و ہند میں ہندو مسلم مسئلے کے پُورے تاریخی پس منظر کو سمجھا جائے اور خاص طور پر ان نئی پیچیدگیوں کا فہم و شعور اور اُن نئی جہتوں کا ادراک حاصل کیا جائے جن کا اضافہ اِس انتہائی اہم و نازک مسئلے میں انگریزوں کے لگ بھگ دو صد سالہ دَورِ اقتدار

میں ہُوا تھا جن کے نتیجے میں صورتِ حال بالکل برعکس ہوگئی تھی اور شدید اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ مستقبل میں ماضی کے حاکم، محکوم اور محکوم حاکم بن جائیں گے ۔ اِس لیے کہ اِسی طرح یہ حقیقت پورے طور پر منکشف ہوسکتی ہے کہ پاکستان کا قیام اُسی ارادۂ خداوندی کا ظہور تھا جو لگ بھگ سوا تین ہزار سال قبل مصر میں ظاہر ہوا تھا، جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورہ قصص کی آیت ۵ میں ان الفاظ میں ہُوا ہے: وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ (ترجمہ) "اور ہم چاہتے تھے کہ اُن لوگوں پر احسان فرمائیں جو ملک میں دبا لیے گئے تھے!" لیکن ظاہر ہے کہ یہ بحث بہت طویل ہے اور موجودہ تحریر کی تنگ دامانی اِس کی متحمل نہیں ہوسکتی ـــــ تاہم اِن شآءَ اللہ العزیز ایک صاحبِ عقل و بصیرت اِنسان کے لیے برصغیر کے ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات کا سرسری جائزہ بھی اِس حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی ہوگا کہ پاکستان کا قیام ایک معجزہ، اور مشیّتِ ایزدی و قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں "قراردادِ پاکستان" منظور ہونے کے بعد برصغیر کے میدانِ سیاست میں متحارب و متقابل قوتوں کے جائزے کا لُبِّ لباب یہ بنتا ہے کہ:

ایک جانب پوری ہندو قوم تھی جو 'اکھنڈ بھارت' کو اپنے دھرم یعنی 'دین و ایمان' کا مسئلہ بنائے ہوئے تھی اور اُس کے نزدیک بھارت کی تقسیم 'گؤ ماتا' کے ٹکڑے کر دینے کے مترادف تھی اور یہ معاملہ اُن کے نزدیک کس قدر جذباتی نوعیت کا تھا اس کا اندازہ گاندھی جی کے اُس تاریخی جملے سے لگایا جاسکتا ہے جو تقسیمِ ہند کے آخری فیصلے سے کچھ ہی دن پہلے اُن کی زبان سے نکلا تھا یعنی "پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے" (مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا وِنز فریڈم۔ صفحہ ۱۶۷) ـــــ یہاں یہ واضح رہے کہ گاندھی جی کوئی عام اور غیر اہم انسان نہیں تھے بلکہ جدید ہند کے بہت بڑے سیاسی لیڈر اور ہندوؤں کے لیے تو ایک عظیم رہنما ہی نہیں 'مہاتما' تھے! اور اُنہیں عام طور پر جذباتی اور مشتعل مزاج انسان نہیں سمجھا جاتا !!

'اکھنڈ بھارت' کے اِس قدر جذباتی اور پُرجوش حامی تو اگرچہ صرف ہندو ہی تھے لیکن انہیں اِس معاملے میں بھرپور تائید حاصل تھی ہندوستان کی جُملہ غیر مسلم اقوام کی ـــــ جیسے سکھ،

پارسی اور عیسائی ـــــــ اور اِس پر مستزاد یہ کہ خود مسلمانوں کے بعض فعّال عناصر تقسیم ہند کے خلاف تھے جن میں اہم ترین معاملہ تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحُوم کی زیرِ قیادت کانگریسی مسلمانوں اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ سرکردگی جمعیت علمائے ہند اور اُن کے متوسّلین اور معتقدین کا تھا پھر پنجاب میں مجلسِ احرارِ اسلام ایسی زور دار عوامی خطباء و مقررین پر مشتمل جماعت تھی اور سرحد میں خدائی خدمت گاروں جیسا پُرجوش عوامی کارکنوں کا گروہ تھا!

اِدھر ہندو خود بھی مسلمانوں کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ تعداد کے اعتبار سے لگ بھگ تین گُنا تھے، بلکہ دولت و سرمایہ اور تجارت و صنعت پر تو تقریباً بلا شرکتِ غیرے قابض تھے اور تعلیم، قومی بیداری اور سیاسی تنظیم کے اعتبار سے بھی آگے تھے ـــــــ اور 'اکھنڈ بھارت' کے پلڑے میں اضافی وزن پڑ رہا تھا دیگر غیر مسلم اقوام اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا ـــــــ اور ان سب کے مقابلے میں بھی مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے والی صرف مسلم لیگ گویا معاملہ بالکل وہی تھا کہ ؏

"لڑا دے ممولے کو شہباز سے!" یا ؏ اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!

چنانچہ اعداد و شمار، حالات و واقعات اور اجتماعیات و عمرانیات کے کسی بھی اصول اور قاعدہ کی رُو سے 'مطالبۂ پاکستان' ایک دیوانے کے خواب اور مجذوب کی بَڑ یا زیادہ سے زیادہ سودے بازی کے حربے (BARGAINING TECHNIQUE) سے بڑھ کر نظر نہ آتا تھا۔

اِس پر مزید اضافہ کیجیے اس کا کہ برطانیہ میں اُس وقت لیبر پارٹی کی حکومت تھی جس کی ہمدردیاں واضح طور پر کانگریس کے ساتھ تھیں اور ہندوستان کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کو اُس نے اپنی پالیسی کا سنگِ بُنیاد (CORNER STONE) بنا لیا تھا، چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب اِس حکومت کے فرستادہ وزارتی مشن نے بنیادی منصوبہ پیش کیا تو اُس کی تمہید کے طور پر واضح الفاظ میں ہندوستان کی تقسیم کو غیر معقول اور ناقابلِ عمل قرار دے کر رَدّ کر دیا تھا ـــــــ مزید برآں اُس وقت تو یہ حقائق صرف اہلِ نظر کی نگاہ اور واقفِ حال لوگوں کے علم میں ہوں گے لیکن اَب تو یہ تمام راز طشت از بام ہو چکے ہیں کہ شخصی اعتبار سے

برطانوی وزیرِاعظم ایٹلے کو مسلم لیگ اور قائدِاعظم سے ذاتی بُغض تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جس کے ہاتھوں قدرت نے ہندوستان کو بالفعل تقسیم کرایا، ایک طرف خود گاندھی کا چیلا تھا تو دوسری طرف پنڈت نہرو کی دوستی صرف اُس ہی سے نہیں اُس کے پورے 'خاندان' سے تھی۔ جبکہ قائدِاعظم سے اُسے ذاتی پرخاش اور نفرت تھی۔

اُدھر وہ مسلم قوم جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا جس انتشارِ ذہن و فکر اور پراگندگیٔ عمل کا شکار اور ہمت و جرائت کے زوال سے دوچار تھی، اُس کا اندازہ اِس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ چند ہی سال قبل مستقبل کے قائدِاعظم اور معمارِ پاکستان نے قوم سے بددل اور مایوس ہو کر وطنِ عزیز سے باضابطہ 'ہجرت' کرلی تھی اور مستقل طور پر انگلستان میں جا ڈیرا لگایا تھا۔ اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں یہ الفاظ کہے تھے کہ

> "ہندو کوتاہ اندیش ہیں اور میرے خیال میں ناقابلِ اصلاح! اور مسلمانوں کی صفیں ایسے کم ہمت لوگوں سے بھری پڑی ہیں جو میرے ساتھ بات کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر سے پوچھیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ان دو گروہوں کے مابین مجھ جیسے آدمی کی جگہ کہاں ہے؟" (شیخ محمد اکرام: ماڈرن مسلم انڈیا)

مزید برآں خود اس جماعت اور اُس کے وابستگان کا عالم کیا تھا جس نے حصولِ پاکستان کے لیے کمر کسی تھی، اِس کا اندازہ کرنے کے لیے قائدِاعظم کے اُس مشہور جملے کو ذہن میں تازہ کر لینا کافی ہے کہ "میری جیب میں کھوٹے سکّے ہیں"۔

ان حالات و واقعات کے مدِّنظر کون کہہ سکتا ہے کہ برِصغیر کی تقسیم اور پاکستان کا قیام کسی 'معجزہ' سے کم تھا!!

——— اور اگر کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامّل ہو اور شک و شبہ کی گنجائش نظر آئے تو اِس ضمن میں آخری فیصلہ کُن معاملہ 'کیبنٹ مشن پلان' کا ہے جس کے بعد اس امر میں کسی شک کا شائبہ بھی باقی نہیں رہ جاتا کہ پاکستان کا قیام مشیت و قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اِس پلان کے مصنفین نے ہندوستان کی تقسیم کو نامناسب ہی نہیں بلکہ

ناممکن العمل قرار دے کر گویا بزعم خویش آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی اور اُس کے بجائے "ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت" کے تحت تین خطوں (ZONES) پر مشتمل وفاق کا نقشہ پیش کیا تھا!

ہندوستان کے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ قائدِ اعظم مرحُوم کی سیاسی زندگی کا نازک ترین مرحلہ اور اُن کے تدبُّر و تحمّل اور دُور اندیشی و معاملہ فہمی کا سخت ترین امتحان تھا!۔۔۔ انھیں ایک طرف صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت مختلف داخلی و خارجی عوامل کے تحت ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹنے پر تلی ہُوئی ہے اور اگر اِس مرحلے پر مسلم لیگ کی جانب سے ذرا بھی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ ہُوا تو لیبر پارٹی کی "ہز میجسٹیز گورنمنٹ" ہندوستان کی حکومت یک طرفہ طور پر کانگریس کے حوالے کر دے گی اور پھر ہندوؤں کے چُنگل سے رہائی پانا شاید لاکھوں نہیں کروڑوں جانوں کی قربانی سے ہی ممکن ہو سکے! دوسری طرف یہ بات بھی واضح تھی کہ اِس منصُوبہ کو تسلیم کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ نے ہار مان لی اور کم از کم وقتی طور پر آزاد اور خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبرداری اختیار کر لی اور گذشتہ چند برسوں کے دوران جو نفسیاتی اور جذباتی فضا ہندوستان کی مسلم قوم میں پیدا ہو چکی تھی، اُس کے پیشِ نظر شدید اندیشہ تھا کہ اِس کے نتیجے میں یا مسلمان مشتعل ہو کر قابو سے باہر ہو جائیں گے یا اُن کے حوصلے اور ولولے ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائیں گے یا کم از کم مسلم لیگ اور خود قائدِ اعظم کی سیاسی موت واقع ہو جائے گی! گویا قائدِ اعظم اور مسلم لیگ دونوں کو اُس وقت ایک جانب کنواں اور دوسری جانب کھائی والی صُورتِ حال سے سابقہ تھا۔ البتہ کیبنٹ مشن پلان میں دو باتیں "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کا مصداق بھی تھیں۔ ایک یہ کہ اُس میں تین خطوں (ZONES) کی صورت میں پاکستان کے نقشے کی دُھندلی سی تصویر موجُود تھی اور دوسرے یہ کہ دس سال کے بعد ہر خطے کے لیے مرکزی حکومت کے ساتھ اپنے تعلّق پر نظرِ ثانی کرنے کی گنجائش موجُود تھی! ۔۔۔۔ اِس طرح اُس وقت نہیں تو دس سال بعد آزاد پاکستان کے قیام کا امکان کم از کم نظری طور پر موجُود تھا۔ اگرچہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ ایک بار مرکزی حکومت کے قیام کے بعد اِس کا بالفعل امکان بہت کم تھا!۔۔۔۔

میرے نزدیک یہ قائدِ اعظم کے سیاسی تدبّر (STATESMANSHIP) اور واقعیت پسندی

(REALISM) کا شاہکار تھا کہ اُنھوں نے ۶ جون ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرلیا۔ اگرچہ اِس پر نہ صرف یہ کہ ہندو پریس نے خوب بغلیں بجائیں، تمسخر اڑایا، کارٹون شائع کیے اور اسے 'پاکستان' کے تصور کی آخری اور حتمی تدفین قرار دیا۔ بلکہ خود برطانوی حکومت نے بھی اِسے مسلم لیگ کی کمزوری پر محمول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کیبنٹ مشن پلان کے تحت بننے والی مرکزی حکومت کی تشکیل کے ضمن میں اپنے ایک صریح وعدے کی خلاف ورزی کی اور واضح اعلان سے اِنحراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی!

اِس موقع پر مشیت ایزدی اور قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور اُس حدیث نبوی ﷺ کے مطابق جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے کہ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں؛ وہ تعالیٰ انھیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے!" پنڈت نہرو کے اُن بیانات کی صُورت میں ہُوا جو اُنھوں نے فتح کے نشے میں بدمست ہو کر دیئے، جن کے نتیجے میں کانگریس کی جانب سے پلان کی منظوری کی بالفعل نفی ہوگئی اور ہندو ذہنیت پُوری طرح بے نقاب ہی نہیں بالکل عُریاں ہو کر سامنے آگئی[1] ——— اِس نوع کی ایک حرکت پلان کے سامنے آتے ہی فوری طور پر خود مسٹر گاندھی سے بھی سرزد ہوگئی تھی لیکن ایک تو وہ کانگریس کے عہدیدار نہ تھے، دوسرے انھوں نے مشن کی جانب سے اُن کی غلط توجیہات کی تردید کے بعد مصلحتاً زبان کو بند رکھا ——— جبکہ پنڈت نہرو کا معاملہ دوسرا تھا، ایک تو وُہ اُس وقت کانگریس کے صدر تھے، دوسرے اُن کے "ہٹ کے پکّے" ہونے کا وصف مشہور و معروف تھا، لہٰذا اُن کے بیانات کے نتیجے میں مسلم لیگ کے لیے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا معقول جواز پیدا ہوگیا اور اگرچہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے پیچ در پیچ ریزولیوشن کے ذریعے پنڈت نہرو کے بیانات کی تلافی کی کوشش کی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور قائدِ اعظم ایسی عقابی نگاہ رکھنے والی شخصیت اِس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے والی نہیں تھی! چنانچہ ۲۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا اعلان کر دیا اور اس طرح ایک آزاد اور خود مختار پاکستان

---

[1] پنڈت نہرو کے الفاظ کچھ اس طرح تھے کہ "ایک دفعہ مرکزی حکومت کے قیام کے بعد پھر کون علیحدہ ہونے دے گا!" (روایت بالمعنی)

کے قیام کا مسئلہ جو نظری طور پر کم از کم دس سال کے لیے اور حقیقتاً ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا، از سرِ نو زندہ ہو گیا ــــــ!!

اب ذرا بتائیے کہ اِس 'اعجازِ مسیحائی' کا سہرا بظاہر احوال اور اِس عالمِ اسباب و علل کی حد تک سوائے پنڈت نہرو کے اور کس کے سر باندھا جا سکتا ہے؟ ــــــ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب (انڈیا ونز فریڈم) میں اپنے پورے سیاسی کیریئر کی صرف ایک ہی غلطی تسلیم کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ۱۹۴۶ء میں کانگریس کا صدر بننا قبول نہ کیا۔ اور اس طرح اُس وقت پنڈت نہرو کی صدارت کی صورت پیدا ہوئی اور اُن کی اس عہدے دارانہ حیثیت ہی کی بنا پر اُن کے 'فرمودات' کو وُہ اہمیت حاصل ہُوئی کہ کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے مسلم لیگ کے دام میں آجانے کے بعد بچ نکلنے کی صورت پیدا ہوئی ــــــ ویسے غور کیا جائے تو پنڈت جی نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یا فتح کی "مستی" میں جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا اور واقعتہً صورت یہی تھی کہ اگر ایک بار اُس پلان کے تحت انڈین یونین گورنمنٹ وجود میں آجاتی تو پھر کسی خطّے (ZONE) کے علیٰحدہ ہونے کا بالفعل کوئی اِمکان نہ رہتا۔ لیکن اُس وقت اِس 'سچی بات' کا زبان سے نکال دینا ہی اکھنڈ بھارت کے نقطۂ نظر سے سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اُن کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی نے اپنے پتاجی کے بارے میں کہا تھا کہ "ہمارے بابا تو صُوفی تھے انھیں سیاست نہیں آتی تھی!" ــــــ اور شاید پنڈت جی کی ایسی ہی باتیں تھیں جن کی بنا پر چوہدری خلیق الزمان مرحُوم نے کہا تھا کہ 'پنڈت نہرو سے زیادہ سیاست تو میرا سائیس جانتا ہے!' (مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۴۳ء تا ۱۴۵ پر پنڈت جی کی ۱۹۳۷ء کی ایک ایسی ہی کوہ ہمالہ جتنی بڑی غلطی کا ذکر کیا ہے جس کا براہِ راست تعلق چوہدری صاحب کی ذات سے تھا جس کی بنا پر مولانا آزاد کے نزدیک یوپی میں مسلم لیگ کی تحریک کو عروج حاصل ہُوا!)

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تصرّف کا مظہر تھا اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے گویا مسلمانانِ ہند پر یہ حجت قائم فرمائی تھی کہ تم تو ایک کلیتہً آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے تھے، ہم نے اپنی خصوصی مشیت و قدرت کو بروئے کار لا کر

تمہیں ایک کاملۃً آزاد و خود مختار پاکستان عطا فرمایا ـــــــ "تاکہ دیکھیں کہ اب تم کیا کرتے ہو!" (سورۃ یونس آیت ۱۴: لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ) ـــ چنانچہ یہ روایت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے معتقدین کے حلقے میں تواتر کے ساتھ بیان ہوتی ہے کہ مولانا نے ۱۹۴۶ء کے رمضان المبارک میں سلہٹ میں جہاں وہ عموماً ماہِ رمضان گذارا کرتے تھے فرمادیا تھا کہ "ملاءِ اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہوگیا ہے!" اور اس پر جب اُن کے کسی عقیدت مند نے سوال کیا کہ "پھر ہم کیا کر رہے ہیں؟" تو مولانا نے جواب دیا کہ اس معاملے کا تعلق امورِ تکوینیہ سے ہے جن کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں!" اَوْکَمَا قَالَ وَاللہُ اَعْلَم!!

قائدِ اعظم مرحوم کی غیر معمولی شخصیت

قیامِ پاکستان کے ضمن میں مشیّت و قدرتِ خداوندی کا دُوسرا نمایاں ظہور قائد اعظم مرحوم کی قیادت کی صورت میں ہُوا تھا اور اُس کے بعد سے اب تک یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت و حفاظت ہی کے ذریعے قائم ہے!

قائد اعظم کی قیادت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برِّصغیر کے حالات میں جو تبدیلی پیدا ہُوئی تھی اُس کے لازمی و منطقی نتیجے کے طور پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب کم از کم مستقبل قریب میں انگریز کی غلامی سے نجات کا حصول کسی عسکری جدوجہد کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ اور اس کے لیے نہ کوئی داخلی بغاوت مفید ہو سکتی ہے نہ خارجی مداخلت بلکہ آزادی کی کوئی جدّوجہد اگر ممکن ہے تو صرف قانونی اور آئینی ذرائع سے! ان حالات میں مسلمانوں کو ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو انگریزوں کی اجتماعی نفسیات سے بھی کما حقہٗ واقف ہو اور اُن سے اُنکی زبان اور محاورے میں گفتگو کر سکے، برطانوی پارلیمانی سیاست کے پیچ و خم اور اسرار و رموز سے بھی پُوری طرح آگاہ ہو اور آئینی و قانونی جنگ لڑنے کی صلاحیت و مہارت سے تو بدرجۂ اتم مسلّح ہو —

مسلمانانِ ہند کے قائدِ وقت کے لیے دوسرا لازمی وصف یہ درکار تھا کہ وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو اچھّی طرح جانتا ہو اور اُن کے احساسات و جذبات اور مقاصد و عزائم کا علم

اُسے بالواسطہ نہیں بلاواسطہ ذاتی تجربہ کی بنا پر حاصل ہُوا ہو نیز وہ اُن کے مخصوص طریقہ ہائے واردات سے بھی پوری طرح واقف ہو اور اُن کے رُموز و اشارات کو بھی خوب سمجھتا ہو! ۔

ان دونوں اوصاف کے مطلوبہ حد تک حصول اور ان دونوں 'گھروں' کے بھیدی ہونے کے لیے لازمی تھا کہ وہ کافی مُدّت تک ع "کہ مَیں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!" کے انداز میں ان دونوں کے 'اندر' رہا ہو اور اُس کی ذہنی و فکری اُٹھان اور سیاسی و عملی تربیت بلاتشبیہہ حضرتِ موسیٰ کی طرح، جن کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی، ان دونوں 'دشمنوں' کے گھروں میں ہُوئی ہو! ـــــــ

کون نہیں جانتا کہ اِن دونوں شرائط پر بتمام و کمال پورا اُترنے والا شخص محمّد علی جناح کے سوا کوئی نہیں تھا جس نے انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور وہاں قیام کے دَوران انگریزوں کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا اور پارلیمانی طور طریقوں کو بھی خُوب سمجھا اور اِس طرح گویا انگریزوں سے اُن ہی کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیّت بدرجۂ اتم حاصل کی، پھر تیس برس کی عمر (۱۹۰۶ء) سے جو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو یہ تعلق پورے چودہ سال تو بھرپور انداز میں جاری رہا (قائدِ اعظم نے کانگریس سے علیحدگی ۱۹۲۰ء کے ناگپور سیشن کے دوران اختیار کی تھی!) اِس کے بعد بھی لگ بھگ آٹھ برس وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیّت سے کام کرتے رہے اور اصلاً اسی عرصہ کے دوران اُن پر ہندو ذہنیّت کا انکشاف ہُوا۔

ظاہر بین لوگوں کے لیے یہ جُملہ اُمور محض اتفاقیہ ہو سکتے ہیں لیکن ع "جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے!" کے مصداق جن لوگوں پر باطنِ ایّام بھی روشن ہوتا ہے اور جو جانتے ہیں کہ اِس کائنات میں کوئی واقعہ بھی خالص 'اتفاقی' طور پر ظہور میں نہیں آتا، انہیں اِن 'اتفاقات' میں بلاشبہ حکمت و قدرتِ خداوندی کا ظہور نظر آئے گا!

بے پناہ مقبولیت

مزید انشراحِ صدر کے لیے ذرا ان اضافی دلائل کو بھی ذہن کے سامنے لے آیئے کہ اُس

وقت تک مسلمانوں کی قیادت دو ہی طبقات کے ہاتھوں میں رہی تھی ـــــــ ایک نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا طبقہ اور دوسرا علماءِ کرام کا طبقہ۔ قائدِ اعظم کا تعلق اِن دونوں میں سے کسی سے نہ تھا چنانچہ ایک طرف انہوں نے ایک ایسے تجارت پیشہ خاندان میں آنکھ کھولی تھی جو طبقہ متوسط ہی نہیں اس کے بھی زیریں حصے سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا دُنیوی اعتبار سے وہ جو کچھ بھی تھے بالکلیہ 'خود ساختہ' (SLEF MADE) تھے۔ دوسری طرف اُن کے والدین کا مذہب 'امامیہ اسماعیلیہ تھا' اور اگرچہ وہ خود اوائل ہی میں ان فرقہ وارانہ تقسیموں سے بلند ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہلوانا پسند فرماتے تھے لیکن جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے نہ وہ واقعۃً 'مذہبی' آدمی تھے نہ انہوں نے کبھی تکلّفاً یا تصنّعاً اپنے آپ کو اِس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ حال ہی میں ایک واقعہ یہ بھی پڑھنے میں آیا ہے کہ ایک ملاقات کے دَوران جب گاندھی جی نے ذرا دل لگی کے انداز (LIGHT VEIN) میں اُن سے کہا کہ "آپ مسلمانوں میں اِس لیے مقبول ہو رہے ہیں کہ آپ مذہب کا نام لیتے ہیں!" ـــــ تو قائدِ اعظم نے ان کی تردید میں بطورِ دلیل اپنا طرزِ عمل پیش کیا کہ "دیکھ لیجیے! یہ رمضان کا مہینہ ہے اور مَیں آپ کے سامنے سگریٹ پی رہا ہوں!" ـــــ تیسری طرف اِس پر غور کیجیے کہ انہیں اردو بس واجبی ہی سی آتی تھی اور وہ اس میں تحریر و تقریر پر قادر نہ تھے۔ جبکہ کسی عوامی رہنما کے لیے عوام کی زبان میں اظہارِ خیال پر کما حقہٗ قدرت نہایت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

اس سب کے باوجود وہ اگر برِصغیر پاک و ہند کی دس کروڑ افراد پر مشتمل قوم کی اکثریت کے محبوب ترین رہنما بن گئے تو کیا یہ خارقِ عادت، واقعہ نہیں ہے؟ اور کیا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ یہ سب کچھ من جانب اللہ تھا اور اس لیے تھا کہ اُن کے ذریعے اللہ کو اپنی ایک خصوصی مشیّت کی تکمیل کرنی تھی؟

غیرمعمولی شخصیّت

قائدِ اعظم کی صلاحیتّوں کے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہونے کے علاوہ ان کی شخصیّت کا ایک اور پہلو بھی 'معجز نما' تھا اور یہ کہ سیرت و کردار اور شخصی اوصاف کے اعتبار سے وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں بالکل ہی نادر المثال اور عجوبۂ روزگار شخصیّت کے مالک تھے اور، علماء و مشائخ سے قطع نظر، جملہ ہمعصر سیاست دانوں میں کوئی ایک شخص بھی اُن کا ہمسر و ہم پلّہ تو دُور کی بات ہے، آس پاس بھی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اُن کے بدترین دشمنوں نے بھی انہیں ضِدّی اور ہٹ کا پکّا (STUBBORN & OBSTINATE)، انتہائی سَرد اور جذبات سے عاری خالص حسابی انسان (COLD & CALCULATING) یہاں تک کہ مغرور اور خود پسند (PROUD & HAUGHTY) تو کہا ـــــ لیکن کسی نے نہ کبھی اُن کی صداقت اور راست گوئی پر حرف رکھا، نہ دیانت اور امانت پر اور نہ کبھی وعدہ خلافی کا الزام لگایا نہ فریب دہی کا بلکہ سب ان کی صاف گوئی اور راست معاملگی (STRAIGHT DEALING) کا برملا اعتراف کرتے رہے اور یہ بات ہمیشہ مسلّم سمجھی جاتی رہی کہ جو کچھ اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے وہی اُن کی مراد ہوتی ہے اور نہ کبھی وہ عام سیاست دانوں کے مانند ؏ "کجامی نمائی کجامی زنی" کا معاملہ کرتے ہیں نہ جھُوٹ، دھوکہ، فریب اور وعدہ خلافی سے کام لیتے ہیں، نہ اُن کے یہاں دروغِ مصلحت آمیز کا وجود ہے، نہ مصنوعی تواضع و مدارات کا اور نہ ریاکارانہ انکساری موجُود ہے نہ چاپلوسانہ خوشامد!

قائدِ اعظم کی اسی غیرمعمولی شخصیّت اور موجُود الوقت ظروف و احوال کے اعتبار سے بالکل اجنبی اور انوکھی سیرت کا نتیجہ ہے کہ آزادیٔ ہند اور تقسیمِ برصغیر کے جُملہ مؤرخین و مصنّفین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عالمِ اسباب میں قیامِ پاکستان کا واحد سبب صرف ایک انسان ہے ـــ اور وہ ہے محمّد علی جناح! یہاں تک کہ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" (FREEDOM AT MIDNIGHT) ـــــ کے مصنفوں نے تو، اِس کے باوجود کہ قائدِ اعظم سے اُن کا بُغض و عناد کتاب کے بہت سے مقامات پر بالکل عریاں طور پر نظر آتا ہے، واضح طور پر حسرت

بھرے انداز میں لکھا ہے کہ اگر وُہ راز جو بمبئی کے ڈاکٹر پٹیل کی دراز میں مقفل تھا کسی طرح فاش ہو جاتا تو بّرِ صغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی اور ہندوستان ہر گز تقسیم نہ ہوتا۔ اِس لیے کہ وُہ راز دراصل قائدِ اعظم کا وہ ایکس رے تھا، جس سے اُن کے پھیپھڑوں کا ٹی بی سے متأثر ہونا ظاہر ہُوا تھا —— اِن مصنّفوں کی رائے میں اگر اُس وقت اِس کا علم حکومت برطانیہ یا کانگریس کی لیڈر شپ کو ہو جاتا تو وہ آزادیٔ ہند کو مؤخر کر دیتے اور قائدِ اعظم کے انتقال کا انتظار کر لیتے' اِس لیے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ مسلمانانِ ہند کے پاس کوئی دُوسرا ''قائد'' ایسا موجُود نہ تھا جسے نہ دھوکہ یا فریب دیا جا سکتا ہو، نہ مرعوب و متأثر کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی خریدا جا سکتا ہو!

اب اگر یہ بات دُرست ہے اور عربی مقولہ ''اَلْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' کے مطابق اِسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں تو ظاہر ہے کہ موجُود الوقت معیارات اور ظروف و احوال کی نسبت سے اِتنی غیر معمولی اور اپنے ہم عصر لوگوں سے اِس درجہ مختلف شخصیت اللہ تعالیٰ کے کسی ارادۂ خصوصی ہی کا مظہر ہو سکتی ہے!!

نصرت و حفاظتِ خداوندی

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کے لگ بھگ اُنتالیس ۳۹ سالوں کے دوران بھی متعدد مواقع پر پاکستان کی حفاظت و صیانت جس طرح ایک نادیدہ مگر قوی ہاتھ نے بالکل اس انداز میں کی کہ ع "دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است!" تو یہ بھی ایک واضح اور بیّن ثبوت ہے اِس کا کہ قدرت کو پاکستان کی بقا اپنے کسی منصوبے کی تکمیل کے لیے مطلوب ہے۔

اِس ضمن میں اولاً قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی پہاڑ ایسی مشکلات اور حد درجہ پیچیدہ مسائل کا تصور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ قطعاً بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان نے اُن کا مقابلہ و مواجہہ جس کامیابی کے ساتھ کیا، اُس کا اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و نصرت کے بغیر قطعاً کوئی امکان نہ تھا!

مشترکہ دفاع کی پیشکش

خاص طور پر ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے فوراً بعد جبکہ بھارت انتہائی ذلّت و خفّت کے ساتھ اپنے زخم چاٹ رہا تھا، سابق صدر پاکستان جنرل محمد ایوّب خان کی جانب سے بھارت کو 'مشترکہ دفاع' کی پیشکش کے معاملے پر غور کیا جائے تو ایک بار پھر کیبنٹ مشن پلان والا معاملہ نظر آتا ہے ــــــ پاکستان پر اُس وقت تک ایوّب خان کی گرفت بہت مضبوط تھی اور کم از کم بظاہر احوال اندرونِ ملک اس تجویز پر کسی شدید ردِّ عمل کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور اس تجویز پر عمل درآمد کے معنی قطعی طور پر یہ تھے کہ گویا ہم ایک بار پھر آزاد و خود مختار پاکستان سے از خود دستبردار ہو کر سجدۂ سہو ادا کرتے ہوئے کیبنٹ مشن پلان کی جانب رجوع کر رہے ہیں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ مولانا

ابو الکلام آزاد مرحوم کی وہ بات درست بھی جو میاں محمد شفیع (م ش) کی روایت کے مطابق مولانا نے کچھ بھارتی ہندوؤں سے تسلّی آمیز انداز میں کہی تھی کہ "پاکستان کے قیام کو گئو ماتا کے ٹکڑے ہونے کے مترادف نہ سمجھو بلکہ یُوں سمجھو کہ بھارت کی گئو ماتا نے ایک بچہ دیا ہے جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے بالکل اُسی طرح چلے گا، جیسے بچھڑا گائے کے پیچھے پھرتا ہے!"

اس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ پیش کش تو صرف مشترکہ دفاع کی تھی اس سے کیبنٹ مشن پلان کی طرف رجوع کیسے ثابت ہو گیا جس میں پورے ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت تجویز کی گئی تھی۔ اس لیے کہ مشترکہ دفاع کے مضمرات اور مقدرات کا جائزہ لیا جائے تو اولاً ——— اس کا لازمی مطلب مشترک خارجہ پالیسی ہے ——— اور ثانیاً چونکہ قومی بجٹ کا سب سے بڑا حصہ دفاع سے متعلق ہوتا ہے لہٰذا مشترک دفاع کا لازمی نتیجہ مشترک بجٹ بھی ہے۔ اس طرح مشترکہ دفاع میں وہ جملہ اُمور مضمر تھے جو کیبنٹ مشن کی تجویز کے مطابق 'انڈین یونین' کو تفویض ہونے تھے سوائے مواصلات کے جو بہر صورت دفاع اور خارجہ اُمور کے مقابلے میں بہت ہی 'معصوم' سا معاملہ ہے۔ مزید برآں جنگ کی صورت میں چونکہ ذرائع رسل و رسائل اور وسائل حمل و نقل بھی لازماً دفاعی مشینری کا جزوِ لاینفک بن جاتے ہیں لہٰذا وہ بھی مشترکہ دفاع کی تجویز میں از خود شامل ہیں۔ گویا اگر بھارت اس تجویز کو قبول کر لیتا تو بالکل کیبنٹ مشن پلان والی صورت بن جاتی اور پاکستان کا آزاد و خود مختار وجود باقی نہ رہتا ———

اس مرحلہ پر پھر مشیت و قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور پنڈت نہرو ہی کے ذریعے ہوا جنہوں نے نہایت رعونت کے ساتھ "COMMON DEFENCE AGAINST WHOM ?" کہتے ہوئے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ——— اور اس طرح پاکستان کی آزادی و خود مختاری کی ناؤ بھنور سے نکل آئی اور بالکل ڈوبتے ڈوبتے بچی!

۱۹۶۵ء میں دشمنوں کی مرعوبیّت

پاکستان کے ایسے ہی 'معجزانہ' تحفظ کا نظارہ پوری دنیا نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر بچشمِ سر کر لیا تھا۔ بھارت نے جس تیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کیا تھا اُس کے پیشِ نظر بھارت کی فتح اور

پاکستان کی شکست نہ صرف بھارت بلکہ اُس کے سرپرستوں کے نزدیک بھی اتنی قطعی اور یقینی تھی کہ بی بی سی نے نہ صرف یہ کہ سقوطِ لاہور کی خبر نشر کر دی تھی بلکہ اُس کا 'منظر' بھی دنیا کو ٹی وی پر دکھا دیا تھا ——— اِدھر تقدیرِ الٰہی خندہ کناں تھی اور "سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ" (سورۃ انفال آیت ۱۲) "میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب پیدا کر دوں گا!" کا بھرپور اعادہ ہو گیا تھا اور دشمن کی افواج مزاحمت کی غیر متوقع حد تک کمی کی بنا پر اِس اندیشے اور خوف ہی میں مبتلا ہو کر ٹھٹھک کر رُکی رہ گئی تھیں کہ کہیں ہمیں کسی خوفناک نرغے میں نہ لیا جا رہا ہو!

۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان کی حفاظت

یہ درست ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ہمیں قیامِ پاکستان کے اصل مقصد سے انحراف اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی سزا بھی بھرپور ملی اور بھارت کے ہاتھوں ایک ذلّت آمیز شکست کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے مشرقی بازو کی علیحدگی کا صدمہ بھی جھیلنا پڑا لیکن اس موقع پر بھی مغربی پاکستان کا بچ جانا خالص آسمانی تدبیر کے ذریعے ہوا ——— ورنہ جائزہ لیجیے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت کا مورال (MORALE) کس طرح ایک دم آسمان پر پہنچ گیا تھا، جبکہ ہمارا مورال 'اسفل سافلین' کے مصداق پاتال میں پہنچ گیا تھا ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور آفیسر بھارت کے اسیر ہو چکے تھے اور ہمارا کثیر تعداد میں اسلحہ اور دوسرا جنگی ساز و سامان بھارت کے قبضے میں آ گیا تھا ——— اور اب بھارت مشرقی محاذ سے فارغ ہو کر اپنی پوری عسکری قوّت کو کامل یکسوئی کے ساتھ مغربی محاذ پر جھونک سکتا تھا ——— اِدھر ہمارا حال یہ تھا کہ ایئر فورس تقریباً مفلوج ہو چکی تھی، نیوی لنگر انداز تھی اور کیماڑی کی بندرگاہ تک دشمن کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہی تھی ——— رہے میدانی محاذ! تو دو محاذوں پر بھارت کی پیش قدمی جاری تھی یعنی راجستھان میں بھی اور سیالکوٹ کی جانب بھی ——— لے دے کر صرف ایک سلیمانکی سیکٹر تھا جس میں ہماری 'ٹاسک فورس' برقرار (INTACT) تھی! ان حالات میں محتاط ترین اندازے کے مطابق مغربی پاکستان بھارت کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ دن کی بات تھی۔

اِس مرحلے پر پھر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیّت کا ظہور ہوا اور امریکی صدر نکسن نے ہاٹ لائن پر روسی لیڈروں کو وارننگ دی اور اُن کے 'حکم' پر اندرا گاندھی نے "یک طرفہ جنگ بندی" کا اعلان کر دیا

اور حال ہی کی بات ہے کہ صدر ریگن نے انکشاف کیا ہے کہ اُس موقع پر ہم ایٹمی قوت تک کے استعمال کے بارے میں سوچ رہے تھے! ——— کم از کم راقم الحروف کو تو شدید احساس ہے کہ اُس موقع پر یہ 'بچا کھچا' پاکستان بھی بالکل اُس طور پر بچا تھا جس طرح کبھی کسی انسان کے بالکل برابر سے کوئی تیز کار یا ٹرک زنّاٹے کے ساتھ اِس طرح گزر جائے کہ موت اور زندگی میں بال بھر کا فاصلہ رَہ جائے اور انسان یہ محسوس کرے کہ جیسے فی الواقع اُسے کسی نادیدہ ہاتھ نے ایک طرف کو دھکیل کر بچایا ہے!!

۱۹۸۳ء کے اندرونِ سندھ کے ہنگامے

پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی نے اگرچہ اپنے والد کو تو 'صوفی' ہونے کا طعنہ دیا تھا لیکن خود اُس کی دستبرد سے اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو اُس ہی کی 'چُوک' کے ذریعہ جس طرح بچایا اُس کا تلخ مزا اُس کے ذائقے میں دیر تک برقرار رہا ہو گا ——— ۱۹۸۳ء کے دوران اندرونِ سندھ کے ہنگامے اپنی وسعت و شدّت اور تیزی و تندی ہر اعتبار سے اکثر لوگوں کے نزدیک حیران کُن اور تعجب خیز تھے اُس وقت اگر براہِ راست مداخلت نہ سہی ذرا سی مدد بھی بھارت کی جانب سے ہنگامہ کرنے والوں کو مِل جاتی تو پاکستان کا وجود شدید خطرے میں پڑ جاتا ——— اِس لیے کہ پاکستان کا وہ علاقہ جو ہنگاموں سے متاثر تھا، بالخصوص میرپور ماتھیلو سے خیرپور میرس تک کی پٹّی پاکستان کے جسم کے نرم و نازک 'پیٹ' (SOFT UNDERBELLY) کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں اگر دو چار جگہوں پر ریلوے لائن اور ہائی وے کو کاٹ دیا جاتا تو گویا پاکستان کی شہ رگ (LIFE LINE) کٹ کر رَہ جاتی۔ چنانچہ اُن ہنگاموں کے دوران اِس کی خبریں تو متعدد بار آئیں کہ گھوٹکی ریلوے اسٹیشن کو جلانے کے علاوہ متعدد مقامات پر ریل کی پٹڑیوں کو اکھاڑنے اور سلیپروں کو جلانے کی کوشش کی گئی لیکن کہیں سے اِس کی اطلاع نہیں ملی کہ ریلوے لائن کو ڈائنامائٹ سے اُڑانے کی سعی کی گئی ہو ——— گویا وہاں جو کچھ ہوا خالص دیسی یا 'خانہ زاد' (INDIGENOUS) وسائل سے ہوا، بیرونی مداخلت یا امداد قطعاً موجود نہیں تھی ——— گویا مسز اندرا گاندھی صرف یہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں کہ ہنگامے ذرا اور پھیل جائیں اور مداخلت کا واضح جواز پیدا ہو جائے تو اقدام کیا جائے ——— اور اِدھر پاکستان کی فوج اور دوسرے دفاعی و حفاظتی اداروں نے ہنگاموں پر قابو پا لیا ——— بعد میں وہ ابھی اپنی اِس 'چُوک' کی تلافی کے لیے کسی بھرپور اقدام کی اسکیم

بنا ہی رہی تھیں کہ خود اُن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

الغرض! ـــــ نہ پاکستان کا قیام حالات و واقعات کی معمول (ROUTINE) کے مطابق پیش رفت کا نتیجہ تھا نہ اِس بچے کھچے پاکستان کا اب تک قائم رہنا کسی عام حساب و کتاب کے مطابق ہے بلکہ اصل پاکستان کا ظہور و قیام بھی ایک 'معجزہ' تھا اور موجودہ پاکستان کی تاحال حفاظت و صیانت بھی اسباب و علل کے عام سلسلے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی خصوصی تدبیر و تصرف ہی کی مرہونِ منت ہے ـــــ

"جن کے رُتبے ہیں سوا......"

رہا یہ سوال کہ پاکستان کے قیام اور بقا سے تدبیرِ الٰہی کا کون سا طویل المیعاد منصوبہ متعلق ہے تو اِس کے بارے میں تو گفتگو ان شاء اللہ آئندہ ہو گی ـــــ موجودہ بحث کے تکملہ کے طور پر اِس حقیقت کی جانب توجہ دلانی ضروری ہے کہ اِس عام قاعدہ کلیہ کے مطابق کہ ع "جن کے رُتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!" اور اللہ تعالیٰ کی اُس مستقل سُنت کی رُو سے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ "اگر تم ہمارے (انعامات پر) قدر شناسی اور احسانمندی کی روِش اختیار کرو گے تو ہم تمہیں مزید نوازیں گے، اور اگر تم نے ناقدری اور کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کیا تو (جان لو کہ) ہماری سزا بھی بہت سخت ہوتی ہے!" (سورۃ ابراہیمؑ آیت نمبر ۷) مسلمانانِ پاکستان بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بڑے سخت امتحان اور کڑی آزمائش سے دوچار ہیں اور ہر حساب و کتاب سے ماوراء اور بڑی سے بڑی توقعات سے بھی بڑھ کر جو احسانِ عظیم قدرت نے کیا تھا اُس کی ناقدری و ناشکری اور صریح وعدہ خلافی پر سزا کا ایک بہت سخت کوڑا مشرقی پاکستان کے سقوط اور وہاں انتہائی ذلت آمیز شکست کی صورت میں ہماری پیٹھ پر پڑ چکا ہے ـــــ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اُس قانون کا مظہر ہے کہ "وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ" "ہم اُنہیں (آخری اور) بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے، شاید کہ یہ (اپنی روِش سے) باز آجائیں" (سورۃ سجدہ آیت نمبر ۲۱) اللہ تعالیٰ

نے ابھی آخری سزا نہیں دی اور تلافیٔ مافات کی مہلت عطا کی ہوئی ہے۔ اِس لیے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ہرگز کوئی حقیر شے نہیں ہے بلکہ وسائل اور امکانات کے اعتبار سے اللہ تبارک وتعالےٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اور لبفضلہٖ تعالیٰ ابھی مشرقی پاکستان بھی نام کی تبدیلی کے باوجود ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اُن ہی حدود کے ساتھ دنیا کے نقشے پر قائم ہے جن کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں اس کا ظہور ہوا تھا ـــــ گویا ابھی موقع ہے کہ اگر جگرؔ کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ـــــ ہم اپنی روش کو اُس آسمانی منصوبے کے مطابق اور موافق بنالیں جس کی ایک کڑی پاکستان کا قیام ہے تو کوئی عجب نہیں کہ برِصغیر کے اُس گوشے میں اسلام کا از سرِنو تمکّن واستحکام جہاں آج سے تیرہ سو سال قبل صنم خانۂ ہند کا اوّلین "دار الاسلام" قائم ہوا تھا، اُس کے کسی نئے عروج کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ ع "رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زبان"

بصورتِ دیگر ہمارا حشر اُس شخص کا سا ہوگا جس کا ذکر سورۂ اعراف کی آیات ۱۷۵، ۱۷۶ میں آیا ہے: "جسے ہم نے اپنی (خاص) نشانیاں عطا کی تھیں مگر وہ اُن سے بھاگ نکلا، تو پیچھے لگ گیا اُس کے شیطان اور شامل ہو کر رہا وہ سخت گمراہوں میں۔ اور اگر ہم چاہتے تو اُسے اپنی نشانیوں کے طفیل رفعتوں کا مکین بنا دیتے مگر وہ (بدبخت) تو زمین ہی کی جانب جھکتا چلا گیا!" ـــــ گویا اِس صورت میں اندیشہ ہے کہ ع ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

عیاذاً باللہ !!

اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور پاکستان

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اَور ہی اَنداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

باب نہم

اسلام کا عالمی غلبہ اور پاکستان

باب دہم

الف ثانی، کی تجدیدی مساعی اور برِّ صغیر پاک و ہند

اِسلام کا عالمی غلبہ اور پاکستان ۱

پاکستان کا معجزانہ قیام ——— قائدِ اعظم کی غیر معمولی قیادت اور پاکستان کی تا حال خصوصی حفاظت وصیانت کی صرف ایک توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی اہم کڑی ہے! ———

اس قضیے (PROPOSITION) یا نظریے (THEORUM) کے دو۲ اجزاء ہیں: ایک۱ یہ کہ بالآخر اسلام پوری دنیا پر غالب آکر رہے گا اور پورے کرّۂ ارضی پر اسلام کی حکمرانی قائم ہو کر رہے گی! ——— اور دوسرا۲ یہ کہ اسلام کے اس عالمی غلبے (GLOBAL DOMINATION) میں ایک اہم اور فیصلہ کن کردار (CRUCIAL ROLE) پاکستان کو ادا کرنا ہے اور یہ گویا پاکستان کی تقدیر (DESTINY) ہے!

ان میں سے جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے، وہ بالکل یقینی اور اٹل ہے اس لیے کہ وہ قرآنِ حکیم سے بھی دلالۃً (BY INFERENCE) ثابت ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ میں تو صراحۃً مذکور ہے اور اس کے ضمن میں گمان اور قیاس کا معاملہ صرف اس مسئلے تک محدود ہے کہ ایسا کب ہوگا؟ ——— البتہ جہاں تک دوسرے جزو کا تعلق ہے تو وہ سراسر یا قیاس وگمان کا معاملہ ہے یا ذوق و وجدان کا۔ چنانچہ اس کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا گمانِ غالب یہی ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز یہی سرزمین بنے گی جس کا نام 'پاکستان' ہے۔ گویا راقم کو علامہ اقبال کے اس شعر سے اتفاق ہے کہ ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے ——— میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے!

واللہ اعلم!

اسلام کے عالمی غلبے کی پیشین گوئی

اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں قرآنِ حکیم میں وارد شدہ 'صغریٰ' اور 'کبریٰ' (PREMISES) سے جو لازمی اور منطقی نتیجہ حاصل ہوتا ہے اُسی کی صریح اور واضح خبر پیشینگوئیوں کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل آپؐ کے اس فرضِ منصبی کا مظہر ہے کہ آپؐ قرآنِ حکیم کے مضمرات اور ارشادات کو کھول کر بیان فرمائیں۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ	"(اے محمدؐ) ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپؐ
لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا	کی جانب اِس لیے نازل فرمایا ہے کہ آپؐ
نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ	وضاحت فرمائیں لوگوں کے لیے اُس چیز
(سورۃ النحل آیت ۴۴)	کی جو اُن کی جانب نازل کی گئی ہے!"

بعثتِ محمدیؐ کا لازمی نتیجہ: دینِ حق کا غلبہ

اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں قرآنِ حکیم کا 'صغریٰ' اور 'کبریٰ' یہ ہے:

(۱) قرآنِ حکیم میں مندرجہ ذیل الفاظ تین مقامات پر بغیر ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے ہیں:

هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ	(ترجمہ) "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے
بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ	رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآنِ حکیم) اور دینِ حق
لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ	(اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل
(سورۃ توبہ آیت ۳۳، سورۃ فتح آیت ۲۸	کے کُل دین (یا تمام ادیان) پر!"
سورۃ صف آیت ۹)	

گویا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد غلبۂ اسلام ہے، خواہ یوں کہہ لیا جائے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے اِس اٹل فیصلے کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ آپؐ کے ذریعے دینِ حق یعنی اسلام کی صرف تبلیغ و دعوت ہی نہیں ہوگی بلکہ اسلام کو بالفعل غلبہ و استیلاء حاصل ہو کر

رہے گا، بہر صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسلام کا بالفعل غلبہ قرآن حکیم کی نص قطعی سے صراحۃً ثابت ہے!

(۲) دوسری طرف قرآن مجید نے ؎ "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق مختلف اسالیب سے اِس حقیقت کو مبرہن اور واشگاف کر دیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کسی خاص قوم یا علاقے کی طرف نہیں بلکہ عالمی اور آفاقی ہے۔ اور پوری نسل انسانی آپؐ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہے۔ چنانچہ کہیں اِس حقیقت کو اِس طور سے بیان فرمایا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ؕ	"ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام جہانوں (یا تمام جہان والوں) کے لیے رحمت بنا کر!"
(سورۃ انبیاء آیت ۱۰۷)	

(واضح رہے کہ "عَالَمِيْنَ" کا ترجمہ 'تمام جہانوں' کے علاوہ عربی گرامر کے اس اصول کے مطابق کہ کبھی ظرف کی جمع سے مراد مظروف کی جمع ہوتی ہے 'تمام جہانوں والے' بھی ممکن ہے!) کہیں یہ بات اِس انداز میں بیان ہوئی کہ آپؐ اگرچہ خود "اُمّیّین" یعنی بنی اسماعیلؑ میں سے ہیں لیکن آپؐ کی بعثت صرف اُن کی جانب ہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ "اٰخَرِيْنَ" یعنی دوسروں کی طرف بھی ہے!

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ	"وہی ہے جس نے اٹھایا اَن پڑھوں میں
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	ایک رسول اُنہی میں کا، پڑھ کر سناتا
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ	ہے اُن کو اُس کی آیتیں اور اُن کو
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ	سنوارتا ہے اور سکھاتا ہے اُن
الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ	کو کتاب اور عقلمندی اور اِس سے
قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ	پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول
وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا	میں اور اُٹھایا اُس رسول کو ایک دوسرے
يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ	لوگوں کے واسطے بھی اُنہی میں سے جو
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝	ابھی نہیں ملے اُن میں اور وہی ہے

زبردست حکمت والا!" (سورۃ جمعہ آیات ۲/۴)

—— اور کہیں بالکل صاف اور صریح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ

(ترجمہ) "ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!" (سورۃ سبا آیت ۲۸)

قرآنِ حکیم کے اِس صُغریٰ و کُبریٰ کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا غلبہ پُورے عالمِ انسانی اور کُل کرّہ ارضی پر ہو کر رہے گا اور یہ وہ تقدیرِ مُبرم ہے جو کسی صُورت ٹل نہیں سکتی، بقول اقبالؔ

تقدیر تو مُبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

البتہ چونکہ قرآنِ حکیم کے اِس اٹل فیصلے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان کو کسی قدر منطق اور استدلال سے کام لینا پڑتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اُس مستقل فرمان کے مطابق جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے اِس کی صریح اور واضح الفاظ میں خبر دی ہے جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلّم نے!

احادیثِ صحیحہ میں غلبۂ اسلام کی پیشینگوئیاں!

(۱) امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مُسند میں حضرت مقداد بن الاسودؓ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ: "روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا نہ اُونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے، خواہ کسی سعادتمند کو عزّت دے کر خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے یعنی یا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو عزّت عطا فرما دے گا اور کلمۂ اسلام کا قائل و حامل بنا دے گا یا اُنہیں مغلوب فرما دے گا کہ اسلام کے محکوم بن جائیں!" حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ کے اِس قولِ مبارک پر مَیں نے اپنے دل میں کہا: "پھر تو (واقعتہً) دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا!" (واضح رہے کہ حضرت مقدادؓ کے ان الفاظ میں اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت نمبر ۳۹ میں وارد شدہ اِن الفاظِ مبارکہ کی جانب کہ (ترجمہ) "اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے

ہو جائے گا۔"

(۲) امام مسلمؒ نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے لیے کُل زمین کو لپیٹ دیا گیا۔ چنانچہ مَیں نے اُس کے (تمام) مشارق و مغارب کو دیکھ لیا ــــ اور یقیناً میری اُمّت کی حکومت اُس پُوری زمین پر قائم ہو کر رہے گی جو میرے لیے لپیٹی گئی!"

راقم الحروف کے نزدیک قرآن حکیم کے ان واضح اشارات اور نبی اکرمؐ کی ان صریح پیشینگوئیوں کے بعد بھی اگر کسی کے دِل میں اسلام کے عالمی غلبے کے بارے میں کوئی شک یا شبہ باقی رہے تو یہ ایمان کے فقدان یا کم از کم شدید ضعف کی علامت ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصریح

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'ازالۃ الخفا عَنْ خلافۃ الخلفاء' میں وجوبِ قیامِ خلافت پر بحث کرتے ہوئے جہاں بعض دوسری آیات کا بھی حوالہ دیا ہے وہاں سورۂ توبہ، سورۂ فتح، اور سورۂ صف کی محولہ بالا آیت پر تفصیلاً بحث کی ہے ــــ اور اس کے اصل مفہوم کو متذکرہ بالا احادیث کی روشنی میں واضح کیا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ بالآخر پُورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ اُسی طرح ہو کر رہے گا جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جزیرہ نمائے عرب پر ہو گیا تھا!

مفکّر و مصوّرِ پاکستان کی پیش بینی

اور یقیناً علامہ اقبال مرحوم نے بھی ؎ "آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی۔ دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!" کے مصداق باطن کی آنکھ سے اُسی "آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر" دیکھ لی تھی جب یہ فرمایا تھا کہ: ؎

آسماں ہو گا سحر کے نُور سے آئینہ پوش

ل وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ط

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

تاریخ کا رُخ

علامہ اقبال نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی ایک عظیم حقیقت کی نشاندہی فرمائی ہے —— یعنی ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس لیے کہ ہر وہ شخص جو "آفاق میں گم" ہو جانے کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو اور ذاتی مسائل و معاملات سے قدرے بلند تر سطح پر تاریخ انسانی کے بہاؤ کے رُخ کا مشاہدہ کر سکتا ہو بادنیٰ تامّل دیکھ سکتا ہے کہ واقعتہً تاریخ کا رُخ اسلام کے عالمی غلبے ہی کی جانب ہے اور قافلۂ انسانی اسی سمت میں رواں دواں ہے! —— اس لیے کہ ایک طرف طبیعاتی علوم (PHYSICAL SCIENCES) ہیں جو درجہ بدرجہ کثرت سے وحدت، گویا شرک سے توحید کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں، دوسری طرف عمرانیات (SOCIAL SCIENCES) ہیں جن کی تحقیق و جستجو چار و ناچار اُسی رُخ پر آگے بڑھ رہی ہے کہ ابلیس کو اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

گویا قافلۂ انسانیت کشاں کشاں "بمصطفےٰ برساں خویش را" پر عمل پیرا ہے اور اجتماعیاتِ انسانیہ کے ضمن

میں واقعہ یہ ہے کہ: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
زاں کہ از خاکش بروید آرزُو
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

تیسرے[۳] طرف اُمّتِ مسلمہ دو[۱] بار عروج اور دو[۲] بار زوال سے دوچار ہونے کے بعد اب ایک تیسرے[۳] عروج کی جانب پرواز کے لیے پَر تول رہی ہے! جس کے اندیشے ابلیسی تہذیب کے جملہ مراکز میں شدت کے ساتھ محسوس ہو رہے ہیں۔ چنانچہ "اسلامی بنیاد پرستی" (ISLAMIC FUNDAMENTALISM) کو گالیاں دی جا رہی ہیں تو کہیں "جارحیت پسندانہ اسلام کی پیش قدمی!" (MILITANT ISLAM ON THE MARCH) کی دہائی دی جا رہی ہے!

ہماری اِس وقت کی بحث کے اعتبار سے اِس آخری نکتے کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے اور اِس سلسلے میں ایک حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں چند آیاتِ قرآنیہ پر تدبّر نہایت مفید ہوگا! جس سے اِن شاء اللہ نہ صرف اِس حقیقت پر یقین و اعتماد میں اضافہ ہوگا کہ ؎

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بَر پیدا

بلکہ اضافی طور پر علم و حکمتِ قرآنی کا ایک اور گراں بہا موتی ہاتھ آئے گا! اور غلبۂ اسلام اور اُمّتِ مسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے عملی اقدام کی جانب اہم رہنمائی ملے گی!

تاریخ بنی اسرائیل کے چار اَدوار!

اِس کتاب کے مقدّمے میں اُس حدیثِ نبویؐ کا ذکر آچکا ہے جسے امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے اور جس کی رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "میری اُمّت پر بھی وہ تمام احوال لازماً وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے بالکل ایسے جیسے ایک جُوتی دوسری جُوتی سے مشابہ ہوتی ہے!" اِس حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں غور

فرمایئے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۱۰، جو درج ذیل ہیں:

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنی) کتاب میں (پہلے
فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي	ہی) متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا
الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ	کرو گے اور بڑی سرکشی کا مظاہرہ
عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا	کرو گے ۔ تو جب آن پہنچا اُن دو
جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا	مواقع میں سے پہلے کا وقت تو مسلط
بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا	کر دیئے ہم نے تم پر اپنے نہایت جنگجو
أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ	بندے جو گھس گئے ہر جانب تمہاری
فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ	آبادیوں میں اس طرح وہ اٹل وعدہ پورا
وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝	ہو کر رہا۔ پھر ہم نے لوٹائی تمہاری باری
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ	اُن پر اور مدد کی تمہاری اموال و اولاد سے
عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم	اور کر دی تمہاری تعداد بہت کثیر۔ اگر
بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ	تم نے بھلا کیا تو اپنے ہی لیے کیا اور
أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ	اگر بُرا کیا تو بھی اپنے ہی لیے۔ پھر جب
أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ	آن پہنچا دوسرے وعدہ کا وقت (تو
وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ	ہم نے پھر کسی قوم کو تم پر مسلط کیا۔)
فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ	تاکہ وہ بگاڑ دیں تمہارے حلیے اور
لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا	گھس جائیں مسجد (ہیکل سلیمانی) میں
الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ	جیسے گھسے تھے پہلی بار، اور تہس نہس
أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا	کر ڈالیں ہر اُس چیز کو جس پر اُن کو
عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝ عَسَىٰ	قابو حاصل ہو جائے۔ (اب بھی)
رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ	بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے
وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا	لیکن اگر تم پھر وہی روش اختیار کرو گے

جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

تو ہم بھی دوبارہ پہلی سی سزا دیں گے، (رہی آخرت تو اس میں تو) ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہی ہوا ہے۔ یقیناً یہ قرآن رہنمائی فرماتا ہے۔ سب سے سیدھی راہ کی جانب اور بشارت دیتا ہے اُن ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال (بھی) کریں کہ اُن کیلئے ہے بہت بڑا اجر و ثواب۔ اور یقیناً جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کیا ہے۔"

ان آیاتِ مبارکہ سے تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن میں حسبِ ذیل حقائق واضح ہوتے ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دَور گزر چکے تھے: دو دَور عروج کے جن کے دَوران اُن کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزّت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور رہے ـــــ اور دو دَور زوال کے جن کے دَوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی، نتیجتہً اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوتے اور اُن کے دینی و رُوحانی مرکز یعنی ہیکلِ سلیمانی کی حرُمت بھی پامال ہوئی۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآنِ حکیم کے نزول کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ایک تیسرے عروج کا موقع عنایت فرمایا کہ ان کا دامن تھام کر اللہ کی رحمت کے سائے میں آجائیں، ساتھ ہی یہ وعید بھی سُنادی گئی کہ اگر اس سے اعراض و انکار کی روش اختیار کریں گے تو عذابِ الٰہی کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔!

قرآنِ حکیم کے اِن اشارات کی روشنی میں تاریخ بنی اسرائیل کا جائزہ لیا جائے تو حسبِ ذیل چار ادوار اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں:

۱۔ اُن کے پہلے دَورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع بن نُون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دَورِ سعادت حضرتِ داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے ساتھ ہی اُن کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا اس لیے کہ فوراً ہی اُن کی سلطنت دو حصّوں میں منقسم ہو گئی۔ بہر حال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچا۔ چنانچہ اس کے دَوران اوّلاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنتِ اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ء قبل مسیحؑ میں مشرق (عراق) سے آنے والے نبوکدنضر کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنتِ یہودیہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں افراد کو قتل کیا چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلّوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا ــــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکلِ سلیمانی کو کلیۃً مسمار کر دیا حتّٰی کہ اُس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! ــــــ بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری (CAPTIVITY) کا دَور بنی اسرائیل کی ذِلّت و رُسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے!

۳۔ بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرتِ مسیحؑ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت عُزیر علیہ السّلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دَور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا اور اِس کا مظہرِ اعظم وہ مکابی سلطنت تھی، جو تقریباً ۱۶۷ ق م سے ۶۷ء ق م تک نہایت دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے دَور کی یاد تازہ کر دی۔

۴۔ بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال ۶۳ء ق م میں رومی فاتح پومپئی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تا حال جاری ہے۔ اِس کے دَوران اوّلاً حضرت مسیح علیہ السّلام کی دعوت سے اعراض و انکار اور اُن کی شدید دشمنی اور مخالفت کی سزا ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس کے ذریعے ملی جس نے دوبارہ یروشلم شہر اور ہیکلِ سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں

کو تہِ تیغ کیا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنالیا ـــــ اِس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اُن پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برستے رہے جن میں تازہ ترین جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں اُن کا قتلِ عام ہے جس کی یاد وہ 'HOLOCAUST' نامی بچھڑ کے ذریعے وقتاً فوقتاً تازہ کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ یہود کے طرزِ عمل کی بنا پر جو مستقل ذِلّت و مسکنت اُن پر مسلط کر دی گئی تھی اُس سے رستگاری حاصل کرنے کا جو موقع اُنہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں "اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ"[1] کے مطابق جناب رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامانِ رحمت کے سائے میں آجانے اور رحمان کی رحمانیت کے مظہرِ اتم اور حبل اللہ المتین کے مصداقِ کامل قرآن کو مضبوطی سے تھام لینے کی صورت میں ملا تھا اُسے تو انہوں نے اپنے تکبّر و غرور کی بنا پر کھو دیا تھا ـــــ اب بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں "حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ"[1] کے مطابق مغربی سامراج کے سہارے اُن کی جو سلطنت قائم ہوئی ہے، قرآنِ حکیم کے اشارات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح پیشینگوئیوں پر یقین رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کی اصل حیثیت گُل ہونے والے شعلے کی آخری بھڑک اور قریب المرگ مریض کے آخری سنبھالے کے سوا کچھ نہیں اور قدرتِ خداوندی نے موجودہ سلطنت اسرائیل کے ذریعے تمام یہودیوں کو رُوئے ارضی کے کونے کونے سے کھینچ کر ارضِ فلسطین میں جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے تاکہ اُن کا آخری استیصال (FINAL EXTERMINATION) اور اجتماعی تدفین (MASS BURRIAL) ایک ہی مقام پر بسہولت ہو جائے۔

---

[1] ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ

(سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۱۲)

"جما دی گئی اُن پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعے سے جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعے سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے غضبِ الٰہی کے اور جما دی گئی اُن پر پستی!"

گذشتہ چودہ سو سال

اور اُمّتِ مسلمہ کے بھی دو۲ عروج اور دو۲ زوال

متذکرہ بالا حدیثِ نبویؐ، آیاتِ قرآنیہ اور تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں جب ہم اُمّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو فرمانِ رسولؐ کی معجزانہ صداقت کا ایک عجیب نقش دل پر قائم ہوتا ہے کہ اِس کے دَوران میں بھی ہُوبہُو وہی دو۲ بار عروج اور دو۲ مرتبہ زوال کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ اُمّتِ مُسلمہ کا پہلا دورِ عروج "امیّین" کی زیرِ سرکردگی لگ بھگ تین ہی صدیوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اِس لیے کہ اگرچہ ویسے تو دورِ خلافتِ راشدہ، دورِ بنی اُمیّہ اور دورِ بنی عباس کی مجموعی مدّت سوا چھ سو سال بنتی ہے لیکن اِس میں سے اصل دبدبہ، مرکزیت اور خالص عربی شوکت و سطوت کا دَور تین سو سال ہی کو محیط ہے۔

۲۔ اُس کے بعد کے چار سو سال زوال کے دَورِ اوّل پر مشتمل ہیں۔ عجیب حیرتناک مشابہت ہے کہ اِس کے 'نقطۂ عروج' پر بھی بالکل وہی صورت نظر آتی ہے کہ اوّلاً شمال سے صلیبیوں کا سیلاب آیا، جس نے شام کے ساحلی علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور ۱۰۹۹ء میں یروشلم کو فتح کر کے مسجدِ اقصٰی کی حُرمت بھی پامال کی اور لاکھوں مسلمانوں کو بھی تہہ تیغ کیا۔ اور پھر مشرق سے تاتاریوں کا سیلاب آیا جس کے دَوران نہ صرف یہ کہ لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے، بلکہ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافتِ عباسیہ کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

۳۔ اِس کے بعد پھر ایک دَورِ عروج آیا۔ لیکن "امیّین" یعنی عربوں کی زیرِ قیادت نہیں بلکہ "آخرین" یعنی غیر عرب اقوام میں سے ایک نہایت قوی اور توانا قوم کی زیرِ قیادت جسے اللہ نے سورۂ محمدؐ کی آخری آیت میں وارد شدہ الفاظ یعنی (ترجمہ) "اگر تم پیٹھ دکھا دو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا" کے مطابق پسند فرمایا۔ چنانچہ اللہ نے پہلے اُنہیں مسلمانوں کی پیٹھ پر عذاب کے کوڑے کے طور پر استعمال فرمایا اور بعد ازاں اُنہی کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی توفیق دے دی بلکہ عالمِ اسلام کی قیادت

بھی اُنہی کے حوالے کر دی ـــــــ بقول اقبال ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ اوّلاً ترکانِ سلجوقی میدان میں آئے، پھر ترکانِ صفوی، ترکانِ تیموری اور ترکانِ عثمانی جن کے ہاتھوں عظیم سلطنتوں کی بنیاد پڑی ـــــ اور ترکانِ عثمانی کی سعادت کا تو کہنا ہی کیا کہ نہ صرف یہ کہ پورے جنوبی ایشیا، شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ پر اُن کی شوکت وسطوت کا سکّہ جما بلکہ خلافتِ اسلامی کا علَم بھی کئی صدیوں تک اُن کے ہاتھوں میں رہا۔

۴۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال دو یورپی قوموں یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھوں آیا تھا، اُمّتِ مسلمہ کا دوسرا دورِ زوال بھی یورپی استعمار کے سیلاب کے نتیجے میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے علم وحکمت اور فلسفہ وسائنس کی قوتوں سے مسلح ہو کر یورپی اقوام جب بیدار ہوئیں تو ایک عربی محاورے "سَمِّنْ کَلْبَکَ یَاْکُلُکَ" یعنی اپنے کُتّے کو کھلا پلا کر موٹا کرو گے تو ایک دن تم ہی کو کاٹے گا! کے مطابق انہوں نے اوّلاً دولتِ ہسپانیہ ہی کو ہڑپ کیا اور پھر ۱۴۹۸ء میں راس امید کے راستے کی دریافت کے بعد مغربی استعمار کا سیلاب اس طویل بحری راستے کے ذریعے عالمِ اسلام کے دائیں بازو پر حملہ آور ہوا ـــــ اور یہ عمل موجودہ صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر تکمیل کو پہنچا جب عظیم سلطنتِ عثمانیہ کا نام ونشان مٹ گیا اور صرف ایک چھوٹا سا ملک ترکی باقی رہ گیا، خلافتِ اسلامیہ کا چراغ گُل ہو گیا ـــــ اور پورا عالمِ اسلام یورپی اقوام کی براہِ راست یا بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا ـــــ عجیب حیرت انگیز مماثلت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے اس دوسرے دورِ زوال کے تتمّے کے طور پر ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کے عہدِ تولیّت کے دوران بھی دوسری بار مسجدِ اقصیٰ کی حُرمت پامال ہوئی اور گزشتہ اٹھارہ برس سے مسلمانوں کا یہ قبلۂ اوّل ایک مغضوب وملعون قوم کے قبضہ وتسلّط میں ہے!

۵۔ جس طرح ایک انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا معاملہ ہے کہ جوانی کی قوّت وشدّت کی بنیادیں بچپن اور لڑکپن ہی میں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں اور بڑھاپے کے ضعف اور ناتوانی کی جڑیں عین جوانی کے عروج کے وقت جسمِ انسانی میں جمنی شروع ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح قوموں اور اُمتوں کا معاملہ ہے کہ اُن کے بھی عین عروج کے وقت زوال کے عمل کا آغاز ہو چکا ہوتا ہے اور

زوال کی انتہا کے ساتھ ہی عروج کی جانب حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب سے لگ بھگ پون صدی قبل جب ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کا ایک دردمند فرزند الطاف حسین حالیؔ اُمّتِ مُسلمہ کی پستی کی انتہا پر نالہ کناں تھا ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے ! اِسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اور ؎
اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

عین اُسی وقت ایک دوسرا مردِ قلندر ملّتِ اسلامی اور اُمّتِ مسلمہ کے عروجِ تازہ کے خواب دیکھ رہا تھا اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ پیش گوئی کر رہا تھا کہ ؎

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا!
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا!
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و برَ پیدا!
اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ نصف صدی قبل تاریخ انسانی اُمّتِ مسلمہ کے ایک تیسرے دَورِ عروج کی جانب سفر کا آغاز کر چکی ہے جس کے نتیجے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا وہ عمل جو الفِ ثانی کے تجدیدی کارنامے سے شروع ہوا تھا اِن شاء اللہ اسلام کے غلبے پر منتج ہو گا۔ اور اس کے ضمن میں دو[۲] امور تو بالکل قطعی اور حتمی ہیں، یعنی ایک[۱] یہ کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۹ کی رُو سے اس کا فیصلہ کن ذریعہ قرآن حکیم کی جانب از سرِ نو رجوع و التفات کے سوا اور کوئی نہیں، اور دوسرے[۲] یہ کہ گذشتہ چار صدیوں کے دَوران جملہ تجدیدی مساعی کا اصل مرکز و محور برِّ صغیر پاک و ہند رہا ہے!۔ البتہ یہ بات صرف گمانِ غالب کے درجے میں ہے کہ اب اس سلسلے کے تکمیلی اقدام کے لیے مشیّتِ ایزدی نے ارضِ پاک کو چن لیا ہے، لیکن یہ بات چونکہ تفصیل طلب ہے لہٰذا اس پر ہمیں مفصّل گفتگو کرنا ہو گی!

الفِ ثانی کی تجدیدی مساعی اور برِّصغیر پاک و ہند

اُمّتِ مسلمہ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران جس طرح دُو بار عروج سے ہمکنار ہو چکی ہے اور دُو ہی بار زوال سے دوچار ہو چکی ہے اُس کا ذکر ؎

"خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"!

کے مصداق سابقہ اُمّت کی تاریخ کے حوالے سے نہایت وضاحت کے ساتھ ہو چکا ہے۔
اب اس سے قبل کہ ہم اُس تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کا جائزہ لیں جس کا آغاز ہمارے مشاہدے کے مطابق تقریباً نصف صدی قبل ہو گیا تھا، آیئے کہ ایک طائرانہ نگاہ اسلام میں کارِ تجدید کی اہمیت و نوعیت اور خاص طور پر اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کے دوسرے ہزار سالہ دَور (الفِ ثانی) میں تجدید و احیاء کے اس عمل کے بالکلیہ برِّصغیر پاک و ہند میں ارتکاز پر ڈال لیں۔ تاکہ اس تاریخی تناظر میں پاکستان کے کردار (ROLE) کی اہمیت پورے طور پر واضح ہو جائے!

ختمِ نبوّت سے پیدا شدہ خلا اور اُس کی تلافی کا اہتمام !

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس پر نبوّت و رسالت کے درجۂ کمال کو پہنچ کر اختتام پذیر ہو جانے سے جو خلاء پیدا ہُوا اُسے حکمتِ خداوندی نے اِس طرح پُر فرمایا کہ:
اوّلاً ——— 'الھدیٰ' یعنی قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کو کامل فرما دیا یا یوں کہہ لیں کہ: "واللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ" (سورہ صف: آیت نمبر ۸) ترجمہ "اللہ اپنے نور کا اِتمام فرما کر رہے گا" کے مِصداق نورِ ہدایت کا اِتمام فرما دیا اور پھر اُس کی حفاظت کا ذمّہ بھی خود لے لیا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥	(ترجمہ) "ہم نے ہی اِس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم خود ہی اس کے محافظ ہیں!"
(سورۂ حجر آیت نمبر ۹)	

——— گویا اب کسی نئی وحی یا نئے نبی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہی، بلکہ صرف "اُس نوعِ انسان را بپیامِ آخریں!" یعنی قرآنِ حکیم کی دعوت واشاعت اور تبلیغ وتعلیم کا کام رہ گیا جس کی ذمہ داری تا قیامِ قیامت اُمّتِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ اس کے لیے آنحضورؐ کی ترغیب و تشویق کی انتہا کا مظہر تو آپؐ کا یہ قولِ مبارک ہے کہ:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔	تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔![1]

——— اور تاکید کی انتہا آپؐ کے اِس فرمان سے ظاہر ہے کہ: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً"

(ترجمہ) "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!"[2]

ثانیاً ——— لگ بھگ ایک ایک صدی کے وقفہ سے ایسے عظیم مجدّدین کا سلسلہ جاری فرما دیا جو درمیانی وقفے کے دَوران پیدا شدہ من گھڑت خیالات وعقائد اور نئی ایجاد شدہ بدعات ورسُومات کا قلع قمع کر کے دینِ حق کی اصل تعلیمات کو ازسرِ نو نکھار کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے لاتے رہیں تاکہ ہدایتِ ربّانی کے رُوئے انور پر جمع ہو جانے والا گرد وغبار وقتاً فوقتاً صاف ہوتا رہے اور وہ خلقِ خدا کے سامنے اپنی اصل شان کے ساتھ جلوہ آرا ہوتا رہے اور اِس طرح ہدایت کے طالب اور حق کے متلاشی لوگوں کو دین کی حقیقی تعلیمات اور فلاح وسعادتِ دارین سے ہمکنار کرنے والے 'صراطِ مستقیم' تک رسائی میں دِقّت نہ ہو ———!

اِسی کے ذیل میں ایک اضافی ضمانت اِس امر کی بھی دے دی گئی کہ دنیا اہلِ حق سے کبھی بالکل خالی نہ ہوگی اور اُمّتِ محمدؐ میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت لازماً حق پر قائم رہے گی۔ ان دونوں کے باہمی ربط سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ہر دَور کی تجدیدی واصلاحی مساعی سے ایک

---

[1] رواہ البخاریؒ عن عثمانؓ ابن عفانؓ [2] رواہ البخاریؒ عن عبداللہؓ ابن عمرؓ

جماعت اہلِ حق کی وجود میں آتی رہے گی جو لگ بھگ ایک صدی تک خلقِ خدا کی صحیح راستے کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی ـــــ تاآنکہ اس عرصے میں وہ خود زوال سے دوچار ہو کر ایک 'فرقہ' بن جائے اور پھر اللہ کسی اور صاحبِ دعوت و عزیمت کو اصلاح و تجدید کی توفیق عطا فرما کر کھڑا کر دے، واللہ اعلم!)

کارِ تجدید اور سلسلۂ مجددین کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظِ مبارکہ سنن ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں وہ یہ ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ	اللہ تعالیٰ اِس اُمّت میں ہر صدی
لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ	کے سرے پر ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا
كُلِّ مِائَةِ عَامٍ مَنْ	جو اُس کے لیے اُس کے دین کو از سرِ نو تازہ
يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا	کرتے رہیں گے!

اس حدیث کی شرح و تفسیر میں دو امور پر علمائے اُمّت کا تقریباً اجماع ہے: ایک یہ کہ سو سال سے مراد لازماً یہی مدّت نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ صرف 'وقتاً فوقتاً' کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بطور محاورہ استعمال ہوئے ہیں، اور دوسرے یہ کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک صدی میں کوئی ایک ہی مجدّد ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں متعدد اصحابِ ہمّت و عزیمت اس کام کے کرنے والے موجود ہوں ـــــ بایں ہمہ حدیثِ نبویؐ کے ظاہری الفاظ کی رعایت سے ہر صدی ہجری کے ضمن میں کسی ایسی اہم ترین اور عظیم ترین شخصیت کی تعیین کی کوششیں بھی عموماً ہوتی رہی ہیں جسے اُس صدی کا مجدّد قرار دیا جا سکے!

'الفِ ثانی' کی تجدیدی مساعی!

اس تحریر میں ہمیں نہ اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کے پہلے ایک ہزار سال کے دوران کے مجدّدینؒ و مصلحین کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، نہ 'الفِ ثانی' کے مجدّدینِ اُمّت کی اصلاحی مساعی یا تجدیدی کارناموں کی تفصیل پیش کرنی ہے بلکہ مقصود صرف اس حقیقت کی جانب توجّہ مبذول کرانا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری سے یہ کارِ تجدید و اصلاح بالکلیہ برِّصغیر پاک و ہند میں مرتکز ہو گیا ہے!

اِس کی ایک ظاہری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ صورت بھی صرف اِس صنم خانۂ ہند ہی میں پیش آئی تھی کہ ؎

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق!

کے مصداق مغلِ اعظم' شہنشاہ جلال الدین اکبر علیہ ماعلیہ نے کچھ اپنی سیاسی اور حکومتی مصلحتوں کی بنا پر اور کچھ سرکاری علماء اور درباری دانشوروں کے سکھانے پڑھانے پر یہ دعویٰ کر دیا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین صرف ایک ہزار سال کے لیے تھا۔ لہٰذا اب اُس کی مدّت ختم ہو چکی ہے اور 'الفِ ثانی' یعنی دوسرے ہزار سال کے لیے ایک نیا دین درکار ہے۔ چنانچہ اُس نے 'دینِ الٰہی' کے نام سے وہ نیا مذہب ایجاد بھی کر لیا اور اُسے حکومت کی قوت و اختیار کے بل پر پھیلانا اور رائج کرنا بھی شروع کر دیا۔ اِس پر ع "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!" کے عام قاعدۂ کلیہ کے تحت رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور ؎

"خونِ اسرائیل آجاتاہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری"

کے مصداق جلالِ فاروقیؓ، شیخ احمد سرہندیؒ کی صورت میں ظاہر ہوا (واضح رہے کہ حضرت مجدّدؒ حضرت عمرؓ کی اولاد سے تھے!) جنہوں نے 'دینِ الٰہی' کے فتنے کا قلع قمع کر دیا اور اصل دینِ محمدیؐ کی ازسرِ نو تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا۔ چنانچہ پُورے عالمِ اسلام میں وہ معروف ہی اپنے اصل نام سے زیادہ 'امامِ ربّانی مجدّدِ الفِ ثانی' کے لقب سے ہو گئے! —— بالکل اُسی طرح جس طرح غزوۂ بدر کے لیے ابوجہل کے پیشگی طور پر استعمال کیے ہوئے لفظ 'یوم الفرقان' کو وحیٔ ربّانی نے اُسی کے منہ پر دے مارا تھا اور "یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ" کو واقعتہً "یَوْمَ الْفُرْقَانِ" ہی بنا دیا تھا (سورۃ انفال: آیت نمبر ۴۱) چنانچہ اب قیامت تک یوم بدر یوم فرقان ہی کے نام سے موسوم رہے گا ——

گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ کے ساتھ ساتھ ایک دوسری اہم صاحب ہمّت وعزیمت شخصیت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی ہے —— اور اس صدی کے دَوران پُورے عالمِ اسلام میں ان دونوں کی ٹکر کی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔

بارہویں صدی میں البتہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ساتھ ساتھ شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدیؒ کی شخصیت بھی نظر آتی ہے اور انہیں اِس بنا پر شہرت بھی زیادہ حاصل ہُوئی کہ اُن

کی تائید اور تعاون سے آلِ سعود نے نجد میں ایک مضبوط حکومت قائم کی جس کا حیطۂ اقتدار جزیرہ نمائے عرب میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ حجازِ مقدس بھی اُن کے زیرِ تسلط آ گیا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ کارِ تجدید کی وسعت اور گہرائی دونوں کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا پلڑا اُن کے مقابلے میں بہت بھاری ہے۔ اِس لیے کہ اگرچہ شیخ محمد ابن عبد الوہابؒ نے مشرکانہ اوہام کا ازالہ اور بدعات و رسومات کا قلع قمع تو خوب کیا اور دین کو اس کے ظاہری پہلوؤں کے اعتبار سے یقیناً جملہ آلائشوں سے پاک کر کے بالکل خالص کر دیا۔ لیکن چونکہ انہیں منطق اور فلسفے سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی لہٰذا دینِ حق کے حکمت و معرفت کے غامض اور عمیق پہلو خود اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے ——— اُن کے مقابلے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نہایت جامع شخصیت کے حامل تھے چنانچہ تفسیر و حدیث اور اصولِ فقہ کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب، منطق و فلسفہ اور تصوّف و سلوک میں بھی درکِ کامل رکھتے تھے۔ اور راقم الحروف اپنے اِس احساس کے بیان میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ قرونِ اولیٰ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی اور شخصیت نظر نہیں آتی ——— ان سب پر مستزاد یہ کہ شاہ صاحبؒ کو جدید عمرانیات کا مُوجدِ اول قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے ضمن میں انہوں نے علامہ ابنِ خلدون کے برعکس جنہوں نے سیاست اور حکومت کے معاملات و مسائل کو زیادہ پیشِ نظر رکھا تھا، عہدِ حاضر کے تقاضوں کی مناسبت سے اصل توجہ 'فلسفۂ ارتفاقات' کے عنوان کے تحت معاشیات و اقتصادیات پر مرتکز کی ہے! ——— بہرحال کم از کم ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے نزدیک اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے مجدد اور دورِ جدید کے 'فاتح' (افتتاح کرنے والے) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ (اور عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ ہندی نژاد بھی فاروقی النسب تھا!)

تیرہویں صدی ہجری میں صنم خانۂ ہند سے پھر ایک ایسی عظیم شخصیت اُبھری جس کی کوئی نظیر دورِ صحابہؓ کے بعد نہیں ملتی۔ ہماری مراد ہے مجاہدِ کبیر اور شہیدِ عظیم سید احمد بریلویؒ سے جنہوں نے سرزمینِ ہند میں پہلی بار خالص نبویؐ نہج پر تحریکِ جہاد برپا کی اور ایک بار دیکھنے والی نگاہوں کے سامنے دورِ صحابہؓ کا عکس پیش کر دیا۔ کارِ تجدید کے منطقی تسلسل کے مظہر کے طور پر انہیں تمام تر تعاون اور سرپرستی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی سے حاصل ہوئی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دو فرزندانِ گرامی شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ عبد القادرؒ نے اُن کی پُشت پناہی کی اور شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی تمام تر

خاندانی وجاہت اور مسلّمہ علمی برتری کے باوجود اُن کے رفیقِ کار اور دستِ راست بننے کی سعادت حاصل کی اور آخر دم تک اُن کا ساتھ بلاتشبیہہ اُسی شان سے دیا جس شان سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ساتھ دیا تھا۔

چودھویں صدی ہجری میں بھی واقعہ یہ ہے کہ جتنے عظیم اربابِ ہمّت وعزیمت اور شہسوارانِ میدانِ تجدید واصلاح برِّصغیر پاک وہند میں پیدا ہوئے اُن کی مثال پورا عالمِ اسلام نہ کمیّت (QUANTITY) کے اعتبار سے دے سکتا ہے نہ کیفیّت (QUALITY) کے اعتبار سے!

اِس صدی کے دوران چونکہ عالمِ اسلام میں مغربی سامراج کے باعث تعلیم وتربیت کے دُو مستقل دھارے جُدا جُدا بہہ نکلے تھے لہٰذا ان دونوں نے اپنا اپنا حق علیحدہ علیحدہ ادا کیا۔ چنانچہ دینی تعلیم وتربیت کے قدیم نظام سے فیضیاب ہونے والوں میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایسی عظیم اور جامع شخصیت بھی یہیں پیدا ہوئی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے جدید نظامِ تعلیم سے مستفید ہونے والوں میں سے علامہ اقبال مرحوم جیسا نابغۂ وقت اور رُومیؔ ثانی بھی اسی خاک سے اُٹھا!

اِس پر مستزاد یہ کہ علماء کے حلقے سے ایک عظیم حرکت 'تبلیغ' کے عنوان سے اِسی خاکِ ہند سے ایسی اُٹھی جس نے اس وقت پورے عالمِ اسلام ہی نہیں' الحمدللہ کہ بہت سے دیارِ کفر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے' اور دوسری جانب زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حلقے سے قوت پاکر اُبھری ایک دوسری عظیم تحریک ــــــ تحریکِ جماعتِ اسلامی ــــــ جس نے پورے عالمِ اسلام پر اثر ڈالا، یہاں تک کہ عالمِ عرب کی عظیم تحریک 'الاخوان المسلمون' کو بھی فکری غذا فراہم کی اور اس وقت اس تحریک کے زیرِ اثر متحرک اور فعّال لوگوں کی ایک کثیر تعداد پورے عالمِ ارضی میں پھیلی ہوئی ہے!

غور کا مقام ہے کہ کیا یہ سب کچھ محض اتفاقات کا کرشمہ ہے یا اس سے فطرت
کی کوئی مشیّت اور قدرت کا کوئی ارادہ ظاہر ہو رہا ہے؟

کیا 'الفِ ثانی' کے مجدّدِ اوّل شیخ احمد سرہندیؒ کا سرزمینِ ہند سے متعلق ہونا ایک بالکل اتفاقی امر ہے جن کے سلسلۂ نقشبندیہ مجدّدیہ کا جال نہ صرف پورے برِّصغیر بلکہ افغانستان اور ترکی تک پھیلا ہوا ہے اور جس کے زیرِ اثر خود رُوس کے زیرِ تسلّط مسلم علاقوں میں بقول "ہر قبا ہونے کو ہے اُس کے جنوں سے تار تار!" کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے؟ اسی طرح کیا جملہ علومِ اسلامی کے مجدّدِ اعظم اور تمدّنِ انسانی کے

دورِ جدید کے فاتح شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کا ہندی نژاد ہونا بھی بالکل اتفاقی امر ہے؟ اور کیا اُن کی عظیم تصانیف کے ذریعے ہونے والی 'تجدیدِ علمِ اسلامی' کے وہ وسیع اور ہمہ گیر اثرات جو پورے برِصغیر کے طول و عرض میں مختلف سلاسل اور مسالک سے منسلک علماء کی صورت میں پھیلے ہوتے ہیں رائیگاں جانے والے ہیں؟ اسی طرح کیا تحریکِ شہیدین ؒ سے وابستہ سینکڑوں مجاہدوں کے مقدّس خون کا ارضِ پاکستان میں جذب ہونا بالکل بے نتیجہ رہے گا؟ پھر کیا جماعتِ شیخ الہند ؒ کی سو سالہ خدمات کوئی عظیم اور پائدار نتیجہ پیدا نہ کرسکیں گی؟ اسی طرح کیا اُس 'حکیم الامت'، ترجمان القرآن اور مصوّرِ پاکستان کا سرزمینِ لاہور میں طویل قیام اور ابدی استراحت بالکل بے معنی ہے جس نے کافرِ ہندی" اور "برہمن زادہ" ہونے کے باوجود 'فلسفۂ خودی' کے عنوان سے 'روحِ ایمان' کی بھی از سرِ نو صحیح ترین تعبیر کی اور معاشرت و معیشت اور سیاست و ریاست کے ضمن میں اسلام کی ہدایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے مطابق صحیح ترین انداز میں پیش کیا؟ پھر کیا اُسی مردِ قلندر کا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو جنوبی ہند سے شمالی ہند کو 'ہجرت' اور یہاں سے اپنی دعوت کے آغاز پر آمادہ کرنا کوئی لااُبالیانہ معاملہ تھا؟

> ہمارے نزدیک یہ تمام واقعات اور اُن کا حیرتناک تسلسل ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا ہے اور وہ یہ کہ مشیّتِ ایزدی نے اسلام کے عالمی غلبے کے نقطۂ آغاز کے طور پر سرزمینِ پاکستان کو منتخب فرمالیا ہے! اور اگر ہمارا گمان صحیح ہے تو ع "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!!"

دعوتِ رجوع الی القرآن

اِس سے قبل سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۹ کے حوالے سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ دینِ حق کی تجدید، اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور اُمّتِ مُسلمہ کے عالمی غلبے کی عملی جدوجہد کا مرکز و محور قرآن حکیم ہے، اِس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کے مطابق قرآن ہی ایک[1] جانب 'ذکرِ حکیم' ہے تو دوسری جانب 'صراطِ مستقیم' ہے اور تیسری جانب 'حبل اللہ المتین' (اللہ کی مضبوط رسی) ہے۔

---

[1] هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ ... (رواہ الترمذی ؒ والدارمی ؒ عن علی ؓ)

اور آپؐ کے ایک دوسرے فرمانِ مبارک کی رُو سے "یقیناً اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو عرُوج عطا فرمائے گا اور اِسی کے سبب سے ذلیل وخوار کر دے گا"[1] چنانچہ اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے علامہ اقبال مرحُوم نے کہ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ!

اِس پس منظر میں غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ 'رجوع الی القرآن' کی تحریک بھی جس شدت وقوت اور جس گہرائی وگیرائی اور جس وُسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ گذشتہ دوسو سال سے برِصغیر پاک وہند میں چل رہی ہے اُس کی بھی کوئی نظیر پُورے عالمِ اسلام میں نہیں ملتی!

واضح رہے کہ یہ تحریک جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں شاہ ولی اللہؒ کی 'الفوز الکبیر' اور فارسی ترجمۂ قرآن اور اُن کے صاحبزادوں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے اُردو تراجم سے شروع ہوئی تھی، انیسویں صدی کے اواخر میں سر سیّد احمد خان مرحُوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی کی غلط اور گمراہ کُن تاویلات کے مخالفانہ ردِّعمل سے ؎

"تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب — یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے!"

کے مصداق مزید جذبہ اور اضافی قوت حاصل کر کے بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحُوم کے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ایک 'دھماکہ' کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور اِس کے بعد اُس نے ایک جانب مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'بیان القرآن' اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ اور حواشی اور بعد ازاں دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث مکاتبِ فکر کے بیسیوں علماء کے تراجم وتفاسیر کی صورت میں پیش قدمی کی تو دوسری جانب یہ علامہ اقبال مرحُوم ایسے 'رومیٔ ثانی' کے کلام میں نہایت پُرشکوہ اور دلآویز انداز اور جدید تعبیرات کے لباس میں جلوہ گر ہوئی ——— اور ان دُو انتہاؤں کے بین بین اس نے ایک جانب مولانا آزاد مرحوم کے معنوی جانشین مولانا مودودی مرحوم کی 'تفہیم القرآن' کی صورت میں ظہور کیا جس نے بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو غلبۂ اسلام کی

---

[1] "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ" (رواہ مسلم عن عمرؓ ابن الخطاب)

عملی جدوجہد کے لیے آمادۂ عمل (MOTIVATE) کیا تو دوسری طرف امام حمید الدین فراہیؒ کے جانشین مولانا امین احسن اصلاحی کی 'تدبر قرآن' کی صورت میں بہت سے تشنگانِ علمِ قرآن کی آسودگی کا سامان فراہم کیا۔

واضح رہے کہ یہاں برِ صغیر پاک و ہند میں گذشتہ ایک سو سال کے دوران پیدا ہونے والے تفسیری لٹریچر کی تفصیل نہ مطلوب ہے نہ ممکن، بلکہ وضاحت صرف اِس امر کی درکار ہے کہ اِس عرصہ میں دعوت الی القرآن اور تفسیرِ قرآن کا کام جس وسعت اور شدت کے ساتھ یہاں ہُوا ہے اور کہیں نہیں ہُوا۔ چنانچہ کم از کم اِس دَور کی حد تک وہ بات جو عام طور پر صرف ایک دلچسپ مقولے کی حیثیت سے بیان ہوتی ہے غلط نہیں ہے کہ "قرآن نازل حجاز میں ہُوا لیکن اِس کی قرأت کا حق ادا کیا اہلِ مصر نے، اور اس کی کتابت میں کمال دکھایا ترکوں نے اور اسے سمجھنے کا حق ادا کیا ہندیوں نے" ــــــ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کچھ اسی انداز میں فرمایا ہے کہ :-

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی!

بہر حال، برِ صغیر کے طول و عرض میں رجوع الی القرآن کی اِس تحریک نے جو اثرات پیدا کیے، ہر شخص جانتا ہے کہ اب حالات نے اُن کو سمیٹ کر ارضِ پاکستان میں مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے ساتھ ذوق و شوق اور شغل و شغف کے علاوہ دعوتِ رجوع الی القرآن کا جو ہما ہمی اور غلغلہ اِس وقت سرزمین پاکستان میں ہے وہ اور کہیں موجود نہیں ہے!

یہاں ایک بار پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ بھی محض اتفاق کا کرشمہ ہے ؟ یا کیا قرآنِ حکیم ایسی ہی غیر مؤثر شے ہے کہ رجوع الی القرآن کی یہ عظیم مساعی بے نتیجہ اور لاحاصل رہیں ؟؟؟

اِن سوالات کا جو جواب ہر صاحبِ ایمان کے قلب کی گہرائیوں سے بے اختیار نکلے گا وہ یہ کہ ہرگز نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم ترین معجزہ تو عصائے موسیٰؑ سے کہیں اعلیٰ و ارفع اور زیادہ کارگر اور مؤثر ہے۔ چنانچہ جملہ باطل عقائد و خیالات اور گمراہ کُن فلسفوں اور نظریوں کو یہ بالکل اُسی طرح ختم کر سکتا ہے جیسے عصائے موسیٰؑ نے ساحرانِ مصر کے سانپوں اور اژدہوں کو ہڑپ کر لیا تھا

اور اُمتِ مُسلمہ کے لیے یہ ہر دَور اور ہر زمانے میں مشکل ترین حالات اور ناموافق ترین کیفیات میں ویسے ہی راستہ بنا سکتا ہے جیسے عصاءِ موسیٰؑ نے سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کے لیے بنایا تھا! چنانچہ یہ ایک اضافی شہادت ہے اِس امر کی کہ ارضِ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بڑے منصوبے کی تکمیل کے لیے چُن لیا ہے!

تحریکِ آزادی میں مذہبی جذبے کی آمیزش

اُمتِ مُسلمہ کی اپنے دُوسرے دَورِ زوال سے نکل کر اُس تیسرے اور آخری عرُوج کی جانب پیش قدمی کا پہلا مرحلہ، جو اِن شاء اللہ العزیز اسلام کے عالمی غلبے پر منتج ہوگی، آزادی کی اُن تحریکوں پر مشتمل ہے جو تقریباً تمام مسلمان ممالک میں بیسویں صدی عیسوی کے ثُلثِ اوّل کے بعد سے چلنی شروع ہوئیں اور صدی کے وسط کے لگ بھگ یکے بعد دیگرے کامیابی سے ہمکنار ہوتی چلی گئیں تا آنکہ اب رُوئے ارضی پر مسلم اکثریت کے علاقوں میں سے صرف چند ہی ایسے رہ گئے ہیں جو اغیار کے براہِ راست عسکری تسلط میں ہوں (اگرچہ مغرب کی ذہنی و فکری، علمی و فنی، معاشی و اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی غلامی تاحال برقرار ہے!)

حصُولِ آزادی کی اِن تحریکوں کے بارے میں ایک بات تو یہ اظہر من الشمس ہے کہ اپنی بنیادی نوعیت کے اعتبار سے یہ نہ دینی و مذہبی تھیں نہ اصلاحی و تجدیدی بلکہ خالص قومی اور سیاسی تھیں اور اِن سب کا تعلق اصلاً تیسری دنیا کے ایک مشترک معاملے (THIRD WORLD PHENOMENON) سے ہے جس کا مذہب سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے —— تاہم اِن کے ذریعے احیاءِ اسلام کی تمنا اور غلبۂ دین کی آرزو کو یقیناً تقویت حاصل ہوئی ہے اور اِن کے ذریعے حاصل شدہ آزادی اِن شاء اللہ العزیز اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا پیش خیمہ اور اسلام کے عالمی غلبے کا مقدمہ ثابت ہوگی!

دوسری اور موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ اِن تحریکوں میں کہیں بھی نہ اسلام کا نعرہ لگا نہ ہی مذہبی جذبے کو اُبھارنے (یعنی INVOKE کرنے) کی کوئی کوشش ہوئی بلکہ اکثر و بیشتر یا تو صرف جذبۂ حُریّت کو للکارا گیا یا کسی نسلی یا لسانی عصبیت کا سہارا لیا گیا، سوائے تحریکِ پاکستان کے کہ یہاں اصل نعرہ ہی یہ تھا کہ:

"پاکستان کا مطلب کیا، لا اِلٰہ الاّ اللہ!"

یہی وجہ ہے کہ علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد نے اس میں بھرپور حصّہ لیا اور وقتی طور پر پُورا مسلم انڈیا مذہبی جذبے سے سرشار ہوگیا۔ اور جیسا کہ ہم اس سے قبل تفصیل سے عرض کرچکے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قیامِ پاکستان کا معجزہ صادر ہوگیا۔

علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے تاریخ ساز اور ولولہ انگیز انقلاب کے بارے میں کسی نظم میں یہ اشعار کہے ہیں :

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچّے　　　کھیلتے جاتے تھے ایوانِ کسریٰ میں شکار

اور　یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن　　　فاش کرنے لگے جبریلِ امیںؑ کے اسرار!

بالکل اسی طرح یہ بھی تحریکِ پاکستان میں اسی زوردار مذہبی جذبہ کی آمیزش کا کرشمہ تھا کہ بیسویں صدی کے عین وسط میں جبکہ پُورے کرۂ ارضی پر الحاد اور مادہ پرستی کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اور دین و مذہب کی بنیادیں تک منہدم ہوچکی تھیں دس کروڑ سے زائد افراد کی ایک قوم نے دستوری اور قانونی سطح پر اپنی قومی و اجتماعی زبان یعنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ کلمۂ شہادت ادا کیا اور 'قراردادِ مقاصد' کے ذریعے حقِ حاکمیت کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرکے اپنے جملہ اختیارات کو اُسی کی معیّن کردہ حدود کے اندر اندر استعمال کرنے کا عہد کیا! چنانچہ اس سے جہاں ع "نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد!" کی کیفیت پیدا ہوئی وہاں (بادنیٰ تصرف) ع "کفر لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد!" کا نقشہ بھی سامنے آیا۔ چنانچہ اسی اسمبلی کے کچھ اراکین نے

"رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!"

کے مصداق برملا کہا کہ "آج یہاں جو قرارداد پاس ہوئی ہے اس کی وجہ سے ہم شرم کے مارے دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے!"

اور یہ بھی اِسی کا کرشمہ ہے کہ پاکستان میں آج تک جتنے دستوری مسوّدے مرتب ہوتے اُن سب میں بلا استثناء وہ دفعہ موجود رہی ہے جو سورۂ حجرات کی پہلی آیت کی دستورِ ملکی کی سطح پر بہترین اور صحیح ترین ترجمانی کرتی ہے اور اسلامی ریاست میں قانون سازی کی گنجائش (SCOPE)

کی بھرپور تعیین کرتی ہے یعنی یہ کہ "یہاں کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکے گی"۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم آج تک اِس دفعہ کو پوری طرح نافذ العمل نہیں کر سکے!؎۱

بہرحال! ایک تیسری مرتبہ پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ کیا دِل مانتا ہے کہ یہ سب کچھ کارِ عبث اور دفترِ بے معنی (EXERCISE IN FUTILITY) ہے؟ اور کیا ہمارا حال اور مستقبل اتنے طویل ماضی سے بالکل منقطع ہو جائیگا؟

جہاں تک ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا تعلق ہے اُس کے نزدیک اس معاملے میں تاخیر اور تعویق تو ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہی نہیں عین متوقع ہے کہ اس راہ میں، ہماری طویل کوتاہیوں اور موجودہ خامیوں کے باعث کچھ نقصانات (SETBACKS) اور وقتی ناکامیوں (FAILURES) اور عارضی شکستوں (TEMPORARY REVERSALS) کا سامنا ہو، لیکن پاکستان کا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بننا وہ تقدیرِ مُبرم ہے جو کسی طرح ٹالی نہیں جا سکتی ——— اور یہی ہے ہمارے قومی و ملّی وجود کی تصویر کا واحد روشن رُخ جو کبھی، جب توجہ اسی پر مرتکز ہو جاتی ہے تو میرے اُفقِ ذہن و قلب پر مہرِ درخشاں کے مانند چمکنے لگتا ہے اور کبھی، جب توجہ زیادہ تر پاکستان کے موجودُ الوقت دینی، اخلاقی اور سیاسی حالات پر مرکوز ہو جاتی ہے تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی صرف ایک مختصر اور لرزتی ہوئی کرن کا روپ دھار لیتا ہے ——— چنانچہ اِسی اُمید و بیم کی کیفیت میں جو کچھ بن آتا ہے کیے جا رہا ہوں اور غالباً ایک حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام میں وارد شُدہ الفاظ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم

؎۱ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	"اے اہلِ ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اسکے رسولؐ سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو، اس لیے کہ یقیناً اللہ سب کچھ سُننے اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔

خلاصۂ مباحث

استحکامِ پاکستان

کا واحد ذریعہ

اسلامی انقلاب

اور سب مل کر

اللہ کی رسّی کو

مضبوط پکڑو

اور پھوٹ نہ ڈالو !

ایک فیصلہ کُن دوراہا

اِن سطور کی تحریر کے وقت قمری حساب سے پاکستان کی عمر کے چالیسویں سال کے مکمل ہونے میں چار ماہ سے بھی کم عرصہ باقی رہ گیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ داخلی اور خارجی' اور دینی اور دنیوی جملہ اعتبارات سے پاکستان اِس وقت ایک نہایت اہم اور فیصلہ کُن دوراہے پر کھڑا ہے۔

دینی اعتبار سے اِس دوراہے کی اہمیّت اور نزاکت قرآنِ حکیم کے دو مقامات کی روشنی میں سمجھ میں آسکتی ہے :

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸ میں وارد شدہ حسبِ ذیل الفاظ کی روشنی میں کہ :

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا۔

(ترجمہ) "قریب ہے کہ تمہارا ربّ تم پر رحمت نازل فرمائے' لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا (جو پہلے کرتے رہے ہو) تو پھر ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے۔ (جو پہلے کر چکے ہیں)"

اِس ضمن میں ایک عام کہاوت کہ "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" کے مطابق اور اُس اصول کے تحت جو ہم اِس سے قبل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ کبھی کبھی مشیّتِ ایزدی کفّار اور ملحدین کے ذریعے بھی پوری ہوتی ہے' رُوسی قائدین کے اُس قول کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو اُنہوں نے اب سے لگ بھگ پندرہ سال قبل سقوطِ ڈھاکہ کے حادثۂ فاجعہ کے بعد ہمارے اُس وقت کے سربراہِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے دورۂ روس کے موقع پر ماسکو میں منعقدہ ایک سرکاری استقبالیہ میں نہ صرف سفارتی آداب اور رکھ رکھاؤ بلکہ میزبانی کے عام دستور اور قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہی تھی کہ :

"ہم نے جو کچھ مشرقی پاکستان کے معاملے میں کیا' ہمیں اُس پر ہرگز کوئی پشیمانی یا ندامت

نہیں ہے بلکہ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر برِصغیر میں دوبارہ اُسی قسم کے حالات پیدا ہوئے تو ہم پھر وہی کچھ کریں گے جو ہم نے اس موقع پر کیا ہے!

(۲) سورۂ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری آیت کے اِن الفاظ کی روشنی میں کہ:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ۔

(ترجمہ) "اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو اللہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور قوم کو قبول فرمائے گا"!

گویا مشیّتِ ایزدی نے تو ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو اسلام کے عالمی غلبہ کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت حاصل کرنے کا بھرپور موقع عنایت فرما دیا ہے۔ اب یہ مسلمانانِ پاکستان کی سعادت یا شقاوت، اُن کے فکر و تخیّل کی بلند پروازی یا پستی، اُن کی عالی حوصلگی یا کم ہمتی اور فی الجملہ اُن کی عزیمت یا سہل انگاری پر منحصر ہے کہ وہ "وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا" کی عملی تصویر بنتے ہیں یا "وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" کی مجسّم تصویر بن کر "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں" کا مصداق بن جاتے ہیں اور اسلام کے عالمی غلبے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو پسند فرما لیتا ہے![1]

عجیب اتفاق ہے کہ عین اُس وقت جب راقم کے قلم سے مندرجہ بالا مصرعہ تحریر میں آیا، روزنامہ جنگ لاہور کا ۱۷ فروری ۸۶ء کا شمارہ آن پہنچا جس کی رُو سے برِصغیر پاک و ہند کے 'باب الاسلام' (یعنی سندھ) کے ایک انتہے معمر سیاستدان نے کہ اُنہیں بقول خود اُن کے سابق وزیرِ اعظم بھٹو مرحوم کے ختنہ کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، کہا ہے کہ:

"میں مطمئن ہوں کہ پاکستان صفحۂ ہستی سے مِٹ جائے گا کیونکہ یہ نفرت کا گہوارہ بن چکا ہے"!

چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اِس وقت ہم ایک نہایت فیصلہ کُن دوراہے کے عین سرے پر کھڑے ہیں۔ اور ہر صاحبِ بصیرت کو بچشمِ سر نظر آ رہا ہے کہ:

ایک جانب ہمارے قومی و مِلّی وجود کا موجودہ دینی و مذہبی، دستوری و سیاسی اور اخلاقی و عملی 'منظر' اور اُس کا چالیس سالہ 'پس منظر' ہے جو بظاہر شیکسپیئر کے الفاظ "TO BE OR NOT TO BE ___ IS THE QUESTION" کے سوالیہ نشان کے ساتھ ایک عقدۂ لاینحل کی صورت

---

[1] قرآنی آیت کے حوالے کے لیے دیکھئے سورۂ اعراف آیت ۱۷۶

اختیار کر چکا ہے نتیجۃً ملک وملت بالکل اُس کیفیت میں نظر آرہے ہیں۔ جس کا نقشہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ (ترجمہ) "تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر تھے!" اور بظاہر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ خاکم بدہن، مکمل تباہی ہمارا مقدر بن چکی ہے!

دوسری جانب اُمّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا طویل پس منظر اور اس کا بالخصوص گزشتہ چار سو سال کا معاملہ ہے جس کے حوالے سے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک نہایت روشن اور تابناک رُخ سامنے آتا ہے اور باطن کے کانوں سے نہ صرف "اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت قریب ہے[۱]!" کا مژدہ سنائی دیتا ہے بلکہ "اللہ کی جانب سے مدد اور فتح قریب ہی ہے[۲]!" کی نوید جانفزا بھی سنائی دیتی ہے۔

تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ جبکہ متذکرہ بالا تاریک رُخ کے منفی نتائج اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکے ہیں جو ٹھوس واقعات کی صورت میں بالفعل موجود ہیں، روشن رخ کی حیثیت صرف ایک 'موقع' کی ہے جو اگر گنوا دیا گیا تو "اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ" (وقت ایک تیز دھار تلوار ہے) کے مطابق پھر کبھی ہاتھ نہ آسکے گا اور ملتِ اسلامیہ پاکستان "وَالْعَصْرِ ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ یعنی 'تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے اور خسارے میں ہے'!" کی مجسّم تفسیر بن کر رہ جائے گی۔ اعاذنا اللہ من ذٰلِکَ!

اساسی عُقدہ اور اُس کے منفی نتائج

جیسے کہ ہم اِس سے قبل واضح کر چکے ہیں، ہمارے قومی اور ملی وجود کا اساسی عُقدہ (DILEMMA) تو یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی صورت میں ایک ایسا ملک قائم کیا ہے جس کی اساس واحد بلکہ واحد منطقی جواز صرف اور صرف 'اسلام' ہے، چنانچہ ایک عوامی اسلامی جذبے کے سوا اِس کے استحکام کی کوئی دوسری ٹھوس اساس موجود نہیں ہے لیکن اسلام کے ساتھ بحیثیت مجموعی ہمارے واقعی اور عملی تعلّق کا حال عدم درجہ

۱۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۵۶)

۲۔ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ۔ (سورۃ الصّف: آیت ۱۳)

مایوس کن بلکہ "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" کا مصداقِ کامل ہے! —— تاہم اِس ایک جملے (STATEMENT) سے نہ صورتِ حال کی پوری نزاکت اور 'گھمبیرتا' کا احساس ہوتا ہے نہ اُن منفی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا ہے جو اِس اساسی عقدے کے منطقی نتائج کے طور پر ہمارے قومی و ملّی وجود پر دینی و مذہبی، اخلاقی و عملی، دستوری و ریاستی اور سیاسی و انتظامی ہر اعتبار سے مرتّب ہوئے ہیں، اِن میں سے بعض پر اِس سلسلۂ مضامین میں اِس سے قبل تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، بعض کا ذکر اِس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ زیرِ بحث موضوع کے دائرے سے براہِ راست متعلق نہ تھے۔ ذیل میں اُن سب کا ایک مختصر خاکہ دیا جا رہا ہے:

(۱) ریاست کی سطح پر ہمارا حال یہ ہے کہ تا حال کوئی متفق علیہ دستور موجود نہیں ہے۔ آج سے دو ڈھائی سال قبل تک ملک کے اکثر سیاسی حلقے ۷۳ء کے دستور پر اتفاق کا اظہار کر رہے تھے لیکن اوّلاً مارشل لاء کی طوالت اور پھر ایک فردِ واحد کے آمرانہ اقدامات نے، جن کی ابتداء 'ریفرنڈم' نامی ڈھونگ سے ہوئی تھی، شدید ردِّ عمل پیدا کر دیا ہے اور اب متعدد طاقتور اور مؤثر حلقے ایک نئی دستور یہ کے انتخاب اور نئے دستور کی تدوین کے مطالبے یا براہِ راست کنفیڈریشن کے نعرے کے ساتھ میدان میں اُتر چکے ہیں!

(۲) سیاسی سطح پر فوج کی مسلسل 'سرپرستانہ نگرانی' نے قوم کو بحیثیتِ مجموعی تا حال 'نابالغ' بنا یا ہوا ہے چنانچہ عوامی سطح پر سیاسی شعور کا خوفناک حد تک فقدان ہے جس کے نتیجے میں ملک بھر میں کوئی ایک بھی ایسی قومی سیاسی جماعت موجود نہیں ہے جو ایک طرف خود منظم بھی ہو اور ملک گیر بھی، دوسری طرف قومی نقطۂ نظر بھی رکھتی ہو اور واضح نظریاتی اساس بھی، تیسری طرف ایک مضبوط اور باصلاحیت قیادت بھی رکھتی ہو اور مخلص اور بے نفس کارکنوں کی معتدبہ تعداد بھی، اور چوتھی جانب عوام میں قابلِ لحاظ حد تک پذیرائی بھی رکھتی ہو اور اثر و نفوذ بھی!!

(۳) معاشی سطح پر شدید افراطِ زر اور اِس سے پیدا شدہ ہولناک گرانی کا سامنا ہے۔ اور ع "چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام۔ یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!" کے مصداق جو مصنوعی خوشحالی نظر آتی ہے وہ یا غیر ملکی قرضوں کے ہمالہ ایسے پہاڑ کی 'کرامت' ہے جو سیاسی اور معاشی اعتبار سے اِنتہائی تباہ کُن ہے یا ملک سے باہر کام کرنے والوں کی خوُن پسینے کی کمائی کی فوری اور عارضی 'برکت' ہے جو مآلِ کار کے اعتبار سے اخلاقی اور سماجی سطح پر سخت مُضر اور نقصان دہ ہے! پھر وہ عارضی برکت بھی اب ختم ہوا چاہتی ہے جس سے فوری معاشی بحران کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے!!

(۴) قومی سطح پر ہمارا شیرازہ سخت پراگندگی کے عالم میں ہے اور مختلف النوع نسلی (ETHNIC)، لسانی (LINGUISTIC) ——— اور علاقائی (REGIONAL) عصبیتوں کے فروغ نے قومی یکجہتی کو شدید ضُعف سے دوچار کر دیا ہے!

(۵) نظریاتی سطح پر قوم کے ذہین عناصر اور تعلیم یافتہ طبقات میں مغربی افکار و نظریات سے پیدا شدہ مادہ پرستانہ اور مُلحدانہ اندازِ فکر اور جدید تہذیب و ثقافت کا پروردہ اباحیت پسندانہ نقطۂ نظر تو پہلے ہی سے موجود تھا، اب اُس کی منطقی انتہا یعنی مارکسزم اور کمیونزم نے بھی ہماری نوجوان نسل کے ایک خاصے بڑے حلقے میں قدم جما لیے ہیں!

(۶) اخلاقی سطح پر قوم کا دیوالہ نکلا ہوا ہے اور اخلاقیات کی اسلامی اور ایمانی سطح تو در کنار عام انسانی سطح پر بھی ہم اخلاق کے بحران (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے، دراصل ہم بحیثیتِ قوم اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی سزا اور پاداش کے طور پر 'نفاقِ عملی' میں مبتلا ہو چکے ہیں!

(۷) دینی سطح پر اسلام کے ساتھ عملی تعلق کے اعتبار سے ہم جس "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!" کی کیفیت سے دوچار ہو چکے ہیں اُس کی تفصیل تو پہلے آ چکی ہے، ایمان کے اعتبار سے بھی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔ اِس لیے کہ عوام کی سطح پر تو 'ایمان' بالعموم ایک عقیدہ (DOGMA) کی ایسی پوٹلی کے مشابہ ہے جو ذہن کے کسی ایک کونے میں رکھی ہوئی ہو اور جس سے انسان کے اخلاقی رویے اور عملی اقدار (VALUE STRUCTURE) کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور خواص میں سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت یا باضابطہ الحاد (ATHEISM) کی شکار ہے یا کم از کم تشکّک (SCEPTICISM) اور لاادریت (AGNOSTICISM) سے دوچار ہے اور علماءِ دین کے حلقے میں ایک کثیر تعداد اُن علماءِ سُوء کی موجود ہے جن کی عملی روش سے ہویدا حُبِّ دنیا، حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ اُن کے 'ایمان' کی ناگفتہ بہ حالت کی غمّازی کر رہی ہے! مزید برآں اُن کی پیدا کردہ فرقہ واریت کی ہولناکی روز بروز بڑھ رہی ہے اور قومی سطح پر تشتّت و انتشار (CHAOS) میں ایک مزید اور حد درجہ تشویشناک سمت (DIMENSION) کا اضافہ کر رہی ہے!

(۸) داخلی احوال و کوائف کی اِن تہ بر تہ تاریکیوں (" ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" سورۃ

نور آیت ۵۰) پر مستزاد ہیں بین الاقوامی سیاست، خارجی تعلقات اور خاص طور پر ارد گرد کے حالات اور اس خطّے کی علاقائی سیاست (GEO-POLITICS) کی شدید تشویشناک کیفیات جن کی بنا پر جو شدید خطرہ (CHALLENGE) پاکستان کے وجود کو اس وقت لاحق ہے وہ اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔ اس لیے کہ اصلاً اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث اور ثانیاً بھارت کی پیدائشی دشمنی کی بنا پر ہم ایک سپر پاور کا سہارا لینے پر تو ہمیشہ ہی مجبور رہے ہیں۔ جس کے عین وقت پر دھوکہ دینے کا نہایت تلخ تجربہ ہمیں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء ہو چکا ہے، تاہم ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے کے بعد سے اُس نے ایک بار پھر ہمیں 'محاذ پر سینہ سپر ریاست' (FRON LINE STATE) کی حیثیت سے اہمیت دینی شروع کر دی تھی اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ایک مرتبہ پھر امریکہ کے سابق سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ڈلس کے نام سے معنون دَور (DULLES ERA) کی یاد تازہ کر دی تھی۔ لیکن اب وہ صورتِ حال تبدیل ہو رہی ہے اور ایک جانب افغانستان کے مسئلے پر امریکہ اور رُوس کے مابین مفاہمت کے اندیشے نے ہمارے پاؤں تلے کی زمین کو سَرکانا اور کھسکانا شروع کر دیا ہے تو دوسری جانب راجیو گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے امریکہ نے بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کی جو سر توڑ کوشش شروع کی ہے اُس کی بنا پر ہمیں فی الواقع دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں اور بھارت کے سفارتی عہدیداروں اور سیکرٹریوں کے اندازِ تخاطب میں بھی "ایاز قدرِ خود بشناس!" کا سا انداز پیدا ہو چکا ہے

الغرض! "عین پیری میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی!" کے مصداق عین اُس وقت جبکہ خارجی حالات کے پیشِ نظر ہمیں کامل قومی یکجہتی وہم آہنگی، بلند حوصلگی اور عالی ہمتی اور قوتِ عزیمت و مقاومت کی شدید ضرورت ہے ملک و ملّت کا داخلی منظر ع "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ مارشل لاء کے 'خاتمے' (یا نیم خاتمے) پر جو سیاسی سرگرمی شروع ہوئی ہے وہ ایک دو ماہ تک گھمسان کے رَن کی صورت اختیار کر لے گی اور اس کے نتیجے میں ملک یا باضابطہ خانہ جنگی اور سول وار سے دوچار ہو جائے گا یا چوتھا مارشل لاء نافذ ہو جائے گا اور یہ دونوں ہی صورتیں ملک و قوم کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خوفناک اور حد درجہ تباہ کن ہوں گی۔ اعاذنا اللہ من ذالک!

پاکستان کے بقا و استحکام کے لوازم

اِس پس منظر میں ہر صاحبِ فہم و شعور انسان لامحالہ اِسی نتیجے تک پہنچے گا کہ ملک و ملت کے استحکام ہی نہیں بقا تک کے لیے حسبِ ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں :

(۱) ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جملہ حیوانی جبلّتوں پر غالب آجائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لیے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے

(۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے !

(۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نَو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد کی اساسات کو از سرِ نو مضبوط کر دے اور قومی و ملّی زندگی کو رشوت، خیانت، ملاوٹ، جھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن برائیوں سے پاک کر دے۔

(۴) ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو مرد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف، اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!

(۵) ایک ایسی مخلص قیادت جس کے اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہ آئے اور جس کے خلوص و اخلاص پر عوام اعتماد کر سکیں!

تحریکِ پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اِس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے اور اسلام کے حوالے اور ناتے سے پورے کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ، جیسے کہ ہم ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد سے ثابت کر چکے ہیں علاّمہ اقبال مرحوم کے حسبِ ذیل اشعار خواہ اِس وقت دنیا کی کسی دوسری مسلمان قوم پر پورے طور پر صادق نہ آتے ہوں، ملّتِ

اسلامیہ پاکستان کے ضمن میں صد فی صد درست اور کمالِ صداقت و حقانیت کے مظہر ہیں کہ ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ !
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟ — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی !

پاکستان کی سالمیّت کے خواہشمند لوگوں کو دعوتِ فکر

مرزا غالب کے اس شعر کے مصداق کہ ؎ "تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم ۔ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے !" ہمیں اس مرحلے پر اُن لوگوں سے تو کچھ نہیں کہنا جو یا کسی حقیقی و واقعی یا مزعومہ و موہوم ظلم اور زیادتی کے ردِّ عمل کے طور پر پاکستان کو توڑنے کے درپے ہو گئے ہوں یا کسی سبب سے اِس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ ؏ "مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی !" کے مصداق پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا ہی غلط تھا۔ لہٰذا اِسے بالفعل یا بالقوّہ معدوم کر دینا ہی مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کا صُغریٰ کُبریٰ ظاہر ہے کہ مختلف ہو گا۔ سردست اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم اُن تمام لوگوں کو جو پاکستان کی بقا اور سالمیّت کے دل سے خواہشمند ہوں دعوت دیتے ہیں کہ پوری دیانت داری کے ساتھ اِمکانی حد تک غور کریں کہ آیا متذکرہ بالا پانچ اُمور پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لوازم ہیں یا نہیں ؟۔ اور آیا اُن میں سے کوئی ایک تقاضا بھی اسلام کے سوا کسی اور نظریے یا نظام کے حوالے سے پورا ہونے کا کوئی امکان ہے ؟؟

اِس ضمن میں حسبِ ذیل حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں :

(۱) تحریکِ پاکستان سے قطع نظر کہ اُس کا تو نعرہ ہی یہ تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ !" پاکستان کی لگ بھگ چالیس سالہ تاریخ کے دَوران میں بھی واقعہ یہ ہے کہ جو بھی عوامی تحریک اُٹھی صرف اور صرف دین و مذہب کے حوالے سے اُٹھی ! ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی ختمِ نبوّت کی تحریکیں تو

اِس کی 'خالص' مثالیں ہیں ہی ، ۱۹۷۰ء کی بھٹو صاحب کی عوامی تحریک کو بھی فی الواقع 'عوامی' بننے کے لیے سوشلزم کو 'مشرف بہ اسلام' کرنا پڑا تھا اور خالص مساوات کی بجائے "مساواتِ محمدیؐ" کی اصطلاح استعمال کرنی پڑی تھی، جس کا شکوہ اب اُن کے بعض سابق رفقاءِ کار کر رہے ہیں پھر ۱۹۷۷ء کی 'پاکستان قومی اتحاد' (P.N.A.) کی تحریک بھی جو ابتداءً خالص سیاسی اور جمہوری تھی 'عوامی' تب ہی بنی تھی جب اُس نے "تحریک نظامِ مصطفےٰؐ" کا عنوان اختیار کر لیا تھا۔

اِس ضمن میں اگرچہ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گزشتہ (یا حالیہ؟) مارشل لاء نے اپنے ساڑھے آٹھ سالہ دَور میں اِس جذبے کو مضمحل کرنے اور اِس تلوار کو 'کند' کرنے یا عوامی زبان میں اِس غبارے کی ہَوا نکالنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے لیکن اب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ پاکستان میں کوئی منفی اور "يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ[1]" کے مصداق تخریبی تحریک تو کسی دوسری اساس پر اُٹھ سکتی ہے لیکن پاکستان کی سالمیت کو بطور اصُولِ موضوعہ تسلیم کرنے والی مثبت تعمیری تحریک سوائے مذہبی جذبے کے اور کسی بنیاد پر نہیں اُٹھ سکتی!

(۲) یہی معاملہ 'نظریۂ جامعہ' کا ہے کہ پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کو ایک بنیانِ مرصُوص بنانے کی صلاحیت رکھنے والا 'نظریہ' صرف اور صرف 'ایمان' ہے اِس لیے کہ ایک رشتۂ اخوّتِ ایمانی ہی ہے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں سے بالاتر ہو کر پاکستان کے مسلمانوں کو ایک 'قوم' ہی نہیں، ایک اُمّت بلکہ ایک 'حزب' (پارٹی) بنا سکتا ہے اور پاکستان میں قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن سکتا ہے۔ یہ بات اِس سلسلۂ مضامین میں تفصیل کے ساتھ عرض کی جا چکی ہے کہ یہاں کوئی نسلی یا لسانی عصبیّت ایسی موجود ہی نہیں ہے جو کُل پاکستان سطح پر بروئے کار آ سکے۔

یہاں یہ وضاحت بھی نامناسب نہ ہوگی کہ الحمدللہ کہ پاکستانی قوم عمل کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی تہی دامن اور کوتاہ دست کیوں نہ ہو، اِسی طرح فقہ کی جزئیات میں اُن کے مابین خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو جہاں تک اساسی نظریے یعنی ایمان کا تعلق ہے اُس کے ضمن میں اختلاف بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور خصوصاً اُس کے منبع و سرچشمہ یعنی قرآن حکیم کے متن کے ضمن میں تو سرے سے

---

[1] سورۂ حشر آیت نمبر ۲ ترجمہ "اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھاتے ہوئے"۔

کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ جس کا حوالہ اسی باب میں پہلے بھی آچکا ہے، مسلمانوں کو "حبل اللہ" یعنی اللہ کی رسّی کو تھامنے کی تاکید کرتی ہے[1] اس کے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیثِ مبارکہ میں صراحت فرما دی ہے کہ وہ قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

"از یک آئینی مسلماں زندہ است — پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است!
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست — اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست"[2]

(۳) اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں یہ حقیقت بالکل قطعی اور حتمی ہے کہ اخلاقیات کے ضمن میں اُن کے یہاں علمِ وظائف الاعضاء (PHYSIOLOGY) کا "سب کچھ یا کچھ نہیں والا قانون" (ALL OR NONE ALAW) کارفرما ہے یعنی یہاں کسی قوم پرستانہ (NATIONALISTIC) یا مصلحت پرستانہ (UTILITARIAN) یا مسرّت پسندانہ (HEDONISTIC) اساس پر بنیادی انسانی اخلاقیات کی تعمیر بھی بالفعل ممکن نہیں ہے اس لیے کہ یہاں اخلاق کی واحد ممکن اساس 'ایمان' ہے۔ وہ اگر بالفعل موجود ہو گا تو عام انسانی ہی نہیں اسلامی اور ایمانی اخلاقِ عالیہ بھی وجود میں آ جائیں گے بلکہ روحانیت کی بلند ترین منزلیں بھی تعمیر ہو جائیں گی اور اگر وہ موجود نہیں ہو گا یا نہایت کمزور اور ضعیف ہو گا تو کسی دوسری اساس پر بنیادی انسانی اخلاق بھی وجود میں نہ آسکیں گے!

(۴) یہ بات البتہ تفصیل طلب ہے کہ وہ واحد نظامِ زندگی جو ایک جانب افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے مناسب فضا فراہم کر سکتا ہو اور دوسری طرف فرد بمقابلہ معاشرہ و ریاست، مرد بمقابلہ عورت، اور سرمایہ بمقابلہ محنت ہر سطح پر اور جہت سے عدل و قسط پر مبنی ہو اور سب کے مابین حقوق و فرائض

---

[1] "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا"

ترجمہ: "سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مبتلا مت ہو۔"

[2] یعنی مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کا راز یہی ہے کہ وہ ایک آئین پر متفق ہیں، گویا پیکرِ ملت کے لیے روحِ حیات قرآن حکیم ہے۔ ہم تمام مسلمان تو در اصل پیکرِ خاکی کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں دھڑکنے والے دِل کی حیثیت قرآن کی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! اُسے مضبوطی سے تھام لے، اس لیے کہ 'حبل اللہ' یعنی اللہ کی مضبوط رسّی وہی ہے۔ (اس ضمن میں قائدِ اعظم مرحوم کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ "ہمارا آئین، چودہ سو سال قبل طے ہو گیا تھا۔")

کے عادلانہ توازن کا ضامن بن سکتا ہو اللہ کے عطا کردہ 'دینِ حق' کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور اگرچہ اِس دعویٰ کی حقانیّت کے تفصیلی دلائل و شواہد اِس تحریر کے دائرۂ بحث سے خارج ہیں تاہم موضوع زیرِ بحث کے اعتبار سے یہ حقیقت اہمیّت کی حامل ہے کہ پاکستان کی مسلمان قوم کے طبقۂ متوسط میں، جو کسی قوم کی اصل ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیّت رکھتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بحمد اللہ بہت کثیر ہے جو دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کے ساتھ اِس کے شدّت کے ساتھ قائل ہیں اور یہ چیز کسی اسلامی انقلابی جدّوجہد کے آغاز کے لیئے یقیناً ابتدائی سرمایہ (INITIAL CAPITAL) کی حیثیّت رکھتی ہے۔!

(۵) گویا ع " کافر نتوانی شُد ناچار مسلماں شو !" کے مصداق ہمارے قومی و ملّی وجُود کے جملہ عوارض و امراض کے ازالے اور معالجے، اور پاکستان کے بقا و استحکام کے لیے جو اُمور لازمی اور ناگزیر ہیں وہ سب کے سب ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہے ہیں اور وہ ہے ' اسلامی انقلاب' کی سمت۔! البتہ ایک قیادت کا مسئلہ ایسا ہے جو بظاہر 'ٹیڑھی کھیر' بھی نظر آتا ہے اور بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کے مترادف بھی محسوس ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ اسلامی انقلاب کے لیے لامحالہ ایک ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو ایک جانب مختلف مکاتبِ فکر سے تعلّق رکھنے والے علماءِ حق کا اعتماد حاصل کر سکے، دوسری جانب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی مطمئن کر سکے اور تیسری جانب عوام میں بھی مقبولیت حاصل کر سکے۔! اور فی الوقت بظاہر احوال جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سہ " نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو۔ ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے !" کے مصداق شاید اُمّتِ مسلمہ کی کوکھ ایسے سپوتوں کے اعتبار سے بانجھ ہو گئی ہے تاہم نویدِ قرآنی "اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا" (ترجمہ) "جان لو کہ اللہ زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے" (سورۃ حدید : آیت ۱۷) کی رُو سے اُمید رکھنی چاہیے کہ اُمّت کی سوکھی کوکھ بھی از سرِ نو ہری ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس ضمن میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ایسی قیادت نہ آسمان سے نازل ہو گی نہ ہی کہیں سے 'در آمد' کی جا سکتی ہے بلکہ اُس کے وجُود میں آنے کی واحد صورت یہی ہے کہ اللہ کے بھروسے پر ایک اِسلامی انقلابی جد وجہد کا آغاز کر دیا جائے اگر اللہ کو منظور ہوا تو اِسی جد وجہد کے دَوران وہ قیادت بھی اُبھر کر سامنے آجائے گی اور اُسے عوام و خواص سب کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے گا!

کامیابی کی اصل ضمانت

اِس جدوجہد کی کامیابی کی اصل ضمانت وہ حقیقت ہے جو ہم "تصویر کا روشن رُخ" اور بالخصوص "اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پاکستان" کے عنوان کے تحت عرض کر چکے ہیں یعنی یہ کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدّوجہد ارادۂ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگی، تدبیرِ الٰہی کے ساتھ ساز گاری اور بقول علامہ اقبال مرحوم "فطرت کے مقاصد کی نگہبانی" کے مترادف ہوگی۔ اِس صورت میں مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کے مطابق اُس جدوجہد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید لازماً حاصل ہوگی اور وہ کیفیت پیدا ہو کر رہے گی کہ ع "ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ"!:

"میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے قُرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب مَیں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو مَیں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔" (بخاریؒ عن ابی ہریرہؓ)

تاہم اِس جدوجہد میں اپنے آپ کو کھپانے کا عزم رکھنے والوں کو کامیابی کی اصل ضمانت صرف اپنے خلوص و اخلاص اور اِس جدوجہد میں اپنی استقامت کو سمجھنا چاہیئے اس لیے کہ اسلامی انقلابی جدّوجہد وہ واحد جدّوجہد ہے جس میں شریک افراد کے لیے ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ بالفرض اجتماعی سطح پر اُس تحریک کی کامیابی سرِدست اللہ کی حکمت میں نہ ہو تب بھی ع "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن ـ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!" کے مصداق اُن کا اصل مقصود تو شہادت علی الناس کے فریضے کی ادائیگی اور شہادت کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

اگلا سوال: ہماری اب تک کی کُل گزارشات کا لُبِّ لباب اور حاصلِ کلام صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:

"پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے!"

اور اسی پر ہم اِس کتاب کو ختم کر رہے ہیں۔

اِس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا ؟ اُس کے اَساسی لوازم کیا ہیں ؟ بنیادی طریق کار کیا ہے ؟ ابتدائی مراحل کیا ہیں ؟ اور تکمیلی اقدامات کیا ہونگے ؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اِن اُمور کی بھی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے ؟ اور اس کے نتیجے میں جو سماجی ، معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئیگا اُس کے اہم خد وخال کیا ہوں گے ؟

چنانچہ ' **پاکستان میں اسلامی انقلاب : کیا اور کیسے** ؟' کے موضوع پر راقم الحروف اِن شآءَ اللہ جلد ہی اپنی دوسری تالیف کا آغاز کر دے گا۔ وما توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم !!

"... مرزا غالب کے اس شعر کے مصداق کہ " تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن
اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے !" ہمیں اس مرحلے پر اُن لوگوں
سے تو کچھ نہیں کہنا جو یا کسی حقیقی و واقعی یا مزعومہ و موہومہ ظلم اور زیادتی
کے ردّعمل کے طور پر پاکستان کو توڑنے کے درپے ہو گئے ہوں یا کسی
سبب سے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ ع "مری تعمیر میں مضمر تھی
اِک صورت خرابی کی!" کے مصداق پاکستان کا معرضِ وجود میں
آنا ہی غلط تھا۔ لہٰذا اسے بالفعل یا بالقوّہ معدوم کر دینا ہی مناسب ہے۔
ایسے لوگوں سے گفتگو کا صُغریٰ کُبریٰ ظاہر ہے کہ مختلف ہوگا۔ سرِدست
اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم اُن تمام لوگوں کو جو پاکستان کی
بقا اور سالمیّت کے دل سے خواہشمند ہوں دعوت دیتے ہیں کہ پوری
دیانت داری کے ساتھ امکانی حد تک غور کریں کہ آیا متذکرہ بالا پانچ امور
پاکستان کی سالمیّت اور استحکام کے لوازم ہیں یا نہیں؟ اور آیا اُن
میں سے کوئی ایک تقاضا بھی اسلام کے سوا کسی اور نظریے یا نظام
کے حوالے سے پورا ہونے کا کوئی امکان ہے؟؟ ..."